اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

جنوری، فروری ۲۰۱۷ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ **البرہان** لاہور

جلد۲۱، شمارہ۱-۲، جنوری، فروری ۲۰۱۷ء/ ربیع الثانی، جمادی الاولیٰ ۱۴۳۸ھ

مشمولات

○شذرات

خوئے غلامی - الفاظ کی واپسی - کروڑوں
لوگوں کے ساتھ دھوکہ دہی کی سرعام وارداتیں — مدیر — ۴

○تعلیم و تبیت

- جدید نظام تعلیم
طلبہ اپنا دین و ایمان بچانے کی فکر کریں — سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ — ۹

- دینی تعلیم کی موجودہ صورت حال — ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ — ۱۷

○میڈیا

اسلام دشمن بلاگرز شکنجے میں — پروفیسر عاصم حفیظ — ۲۱

○فہم دین

اقامت دین کا صحیح تصور کیا ہے؟ — عبدالرحمن — ۲۴

○استفسارات

مغربی فکر و تہذیب کا ردّ
کیا مدیر البرہان کا موقف شدت پسندی پر مبنی ہے؟ — ڈاکٹر محمد امین — ۲۸

○نوائے حق

پہنچی وہیں پہ خاک - ایک جرأت مند وکیل کی تلاش — ''حق گو'' — ۳۴

○اسلامی تحریکیں

اسلامی انقلابی جدوجہد ٹرمپ کی کامیابی
سے کیا سیکھ سکتی ہے؟ اور البرہان کا تبصرہ — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۳۶

○اسلام اور مغرب

اسلام اور گلوبلائزیشن (آخری قسط) — پروفیسر ڈاکٹر خالد علویؒ — ۴۴

○اسلام اور پاکستان

- قتل غیرت کا قانون غیر اسلامی ہے — ملی مجلس شرعی — ۴۸
- پاکستان کا مخدوش اسلامی مستقبل - قابل عمل اصلاحی تجاویز — ادارہ — ۴۹

○تبصرہ کتب

- محاضراتِ تعلیم از ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ — مدیر — ۵۵
- دلیل کا دور - بنک انٹرسٹ: منافع یا ربا؟ از محمد انور عباسی — ۵۶

شذرات مدیر

خوئے غلامی

تقسیم ملک تک ہم برطانیہ کے غلام تھے۔ پاکستان بنا تو غلامی کے خوگر حکمرانوں اور بیوروکریسی نے ہمیں امریکہ کا غلام بنادیا۔اس کے نتیجے میں جو کچھ ہوا اس کی داستان طویل بھی ہے اور دل خراش بھی۔ ۷۰ برس بیت گئے، ہم جیسے کئی لوگ تنقید بھی کرتے رہے لیکن پرنالہ وہیں کا وہیں رہا۔ یہاں تک کہ مغرب کی الحادی فکر وتہذیب ہمارے فرد، معاشرے اور ریاست پر غالب آ گئی اور اسلام بے چارہ برائے نام رہ گیا۔امریکہ کی نوازشوں سے پاکستان دولخت ہوگیا اور اب بچے کھچے پاکستان کو بھی کمزور کرنے اور توڑنے میں امریکہ اپنے حلیفوں بھارت اور افغانستان کی مدد سے جتا ہوا ہے۔قوم کو ۱۱۸ بلین ڈالر کا نقصان ہو چکا ہے، ۵۵ ہزار سے زیادہ بے گناہ پاکستانی (سویلین اور فوجی) مارے جاچکے ہیں لیکن ہماری خوئے غلامی بدستور قائم ہے۔

اگرچہ ایوب خاں کی ''آقا نہیں، غلام'' (Frleds not Masters) کو لکھے ہوئے دہائیاں گزر گئیں لیکن لگتا ہے کہ جتے ہوئے بیل کے کندھے اب ہل کھینچ کھینچ کر دکھنے لگے ہیں لیکن چونکہ وہ ''بیل'' ہے اور جتے رہنے کا عادی ہوگیا ہے اس لیے وہ آزادی کا تو سوچ نہیں سکتا البتہ یہ چاہتا ہے کہ اب آقا بدل جائے۔ آقا بدلنے سے ممکن ہے ہل کا سائز بدل جائے یا چھڑی کا میٹریل بدل جائے۔ چنانچہ اب پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے چین کو نیا آقا بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔اور جیسا کہ میڈیا کی خبروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سی پیک پاکستان کا منصوبہ نہیں کہ چین بحیثیت دوست پاکستان کی مالی یا انتظامی مدد کر رہا ہے بلکہ یہ سارا پروجیکٹ چین کا ہے اور چین اس کے لیے پاکستان کو قرض دے رہا ہے جو وہ سود سمیت واپس لے گا اور قبضہ اس کا ہوگا۔ چنانچہ بہت سے دوسرے میگا پراجیکٹس بھی سی پیک میں شامل کیا جا رہے ہیں۔سٹاک ایکسچینج کا ایک بڑا حصہ بھی چین کو دے دیا گیا ہے اور خبریں آرہی ہیں کہ چند برسوں بعد بلوچستان میں چینی آبادی مقامی آبادی سے بڑھ جائے گی۔ یہ بعینہٖ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اسلوب ہے۔

ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ مَیں کل 'سی پیک' کا تعارفی بروشر دیکھ رہا تھا۔انڈسٹری، روڈ زہر موضوع کا ۱۲، ۱۳ صفحات میں تعارف کرایا گیا ہے لیکن ٹورزم والے سیکشن کے لیے ۳۶

صفحات وقف کیے گئے ہیں اور جیسا کہ معروف ہے ٹورزم کی کامیابی کا انحصار دو چیزوں پر ہوتا ہے: ایک شراب اور دوسرے شباب، جو میزبان پاکستان مہیا کرے گا۔

بہرحال قوم کو نئی غلامی مبارک ہو۔ اگرچہ یہ وہی پرانی مغرب کی الحادی فکر وتہذیب والی شراب ہے لیکن بوتل بہرحال نئی ہے اور ہر نئی چیز خوبصورت لگتی ہے اور اسے شوق سے استعمال کرنے کو دل چاہتا ہے اور اس کو دوآتشہ کیا ہے ہمارے چین کے ساتھ اس وعدے نے کہ آپ سنکیانگ کے کروڑوں مسلمانوں کے ساتھ جو چاہیں کریں، ہم نہیں بولیں گے۔ آپ انہیں نماز نہ پڑھنے دیں، عورتوں کو پردہ نہ کرنے دیں، لوگوں کو حج نہ کرنے دیں، ہم خاموش رہیں گے۔ ہم نے کون سا پاکستان میں شریعت نافذ کرلی ہے کہ ہمیں دکھ ہو کہ سنکیانگ کے مسلمانوں کو شریعت پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ بہرحال، قوم کو اس نئی غلامی کی دوبارہ مبارکباد۔

الفاظ کی واپسی

سپریم کورٹ میں پانامہ کرپشن کیس کے دوران جب تحریک انصاف کے وکیل نے اپنے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ نواز شریف صاحب نے کرپشن کی ہے لہٰذا دستور کی دفعہ ۶۲، ۶۳ کی خلاف ورزی کی بناء پر ان کی اسمبلی کی رکنیت ختم کردی جائے (یعنی انہیں بطور وزیراعظم نااہل قرار دیا جائے) تو ایک فاضل جج نے ریمارکس دیتے ہوئے کہا کہ اگر دفعات ۶۲، ۶۳ کا نفاذ کردیا جائے تو سارا ایوان خالی ہوجائے گا۔ مطلب یہ کہ پارلیمنٹ میں سب کرپٹ لوگ بیٹھے ہیں۔ جس ادارے میں اور جس کرسی پر جج صاحب بیٹھتے ہیں ان کی طرف سے ایسی بات کہنے کے جو قانونی مضمرات ہوسکتے ہیں، ان کی گھمبیرتا کے پیش نظر جسٹس صاحب نے دوسرے دن اپنے الفاظ پر معذرت کی اور ان کے واپس لینے کا اعلان کردیا۔ چونکہ جسٹس صاحب نے الفاظ واپس لینے کا اعلان کردیا ہے اس لیے اُن پر ہمارا تبصرہ بے محل ہوگا۔ تاہم یہ واقعہ اتنا اہم اور دوررس ہے کہ اس پر گفتگو کیے بغیر چارہ نہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ جسٹس صاحب نے جو کچھ کہا تھا، ٹھیک کہا تھا البتہ اپنی منصبی مجبوری کی وجہ سے انہوں نے اپنے الفاظ واپس لے لیے۔ ان کی طرح ہم بھی اپنے 'منصب' کی وجہ سے مجبور

ہیں لہٰذا ہم وہی الفاظ کہتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ ہم انہیں واپس نہیں لیں گے۔جسٹس صاحب کی مجبوری یہ ہے کہ ان کی کوچہ قانون میں عمر گزر گئی۔انہوں نے قانون پڑھا، برسوں اس کی پریکٹس کی، پھر برسوں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں منصف کی کرسی پر بیٹھ کر اس قانون کی تشریح اور تنفیذ کی نگرانی کی۔'سٹیٹس کو' کے ساتھ یہ طویل مجالست آدمی کی انقلابیت ختم کردیتی ہے لیکن ایک داعی، دانشور، مصلح، دینی عالم، صحافی اور تجزیہ کار یہ سچی بات کہہ کر اس پر سٹینڈ لے سکتا ہے۔ بلکہ ہم تو مغربی جمہوریت کو مخاطب کر کے کہہ سکتے ہیں کہ دیکھ لو بی! یہی پارلیمنٹ شاہکار ہے تیرے ہنر کا۔کہ معاشرے کی تلچھٹ قیادت پر براجمان ہوجاتی ہے چاہے وہ ٹرمپ ہو، مودودی ہو یا مشرف۔

دیکھا جائے تو جج صاحب کے یہ جملے ایک طمانچہ ہیں ہماری دینی قیادت پر، ہمارے مصلحین اور واعظین کے کام پر کہ تم نے ۷۰ سال تک اس معاشرے میں یہ انسان سازی کی ہے؟ تعمیر شخصیت اور اصلاح معاشرہ کا یہ کام کیا ہے؟ یہ درحقیقت تمہاری ناکامی ہے۔

امریکہ ہو یا پاکستان
اپنے کروڑوں عوام اور دوسری اقوام کے ساتھ دھوکہ دہی کی سرعام وارداتیں

نبی صادق ﷺ کی پیشین گوئیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ قیامت سے پہلے زنا اور دوسری بدمعاشیاں کھلے عام ہونے لگیں گی۔آج ہم اپنی آنکھوں سے اس پیشین گوئی کو پورا ہوتے دیکھ رہے ہیں۔مغرب میں تو خیر زنا کھلے عام ہوتا ہے۔ہمارے ہاں بھی اب بہت کچھ سرعام ہورہا ہے۔قحبہ خانے بھی ہیں، 'کوٹھیاں' بھی ہیں۔ہر بڑے شہر میں 'مساج سنٹر' بھی ہیں۔نیٹ پر ان کے فون نمبر بھی موجود ہیں۔نیٹ پر تو آپ سب کچھ ویسے ہی دیکھ سکتے ہیں۔(اور پنجاب کے ۹ کروڑ مسلمانوں میں اگر کسی نوجوان کے پاس کمپیوٹر نہ ہو تو ''خادم اعلیٰ'' شہباز شریف صاحب اسے مفت مہیا کردیتے ہیں۔اور وہ بھی اہل مغرب سے مہنگے داموں خرید کر اور وہ بھی غریب مسلمان عوام کے پیسوں سے) ہمارا میڈیا بھی کسی سے پیچھے نہیں اور ہماری یونیورسٹیوں کی مخلوط تعلیم میں بھی بہت کچھ سرعام ہورہا ہے۔(اور لطف کی بات یہ ہے کہ علماء اور دینی جماعتیں بھی

موجود ہیں اور وہ بچاری دن رات ''دینی کاموں'' میں سخت مصروف بھی ہیں؟؟؟)

خیر، تو ہم کہہ رہے تھے کہ پہلے سازشیں ہوتی تھیں، جرم رات کے اندھیرے میں ہوتا تھا اب انفرادی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر سب کچھ کھلے عام ہوتا ہے۔ امریکہ میں متعصب عیسائی اور اسلام و مسلم دشمن صدر بش نے ۱۱/۹ کے ڈرامے کے ذریعے نہ صرف مغرب میں پھیلتے ہوئے اسلام کو روکنے کی کوشش کی اور بعض مسلمان ملکوں میں ہونے والے اسلامی اقدامات اور اسلامی لہر کو تہس نہس کرنے کا سامان کیا بلکہ اپنے ملک کے پڑھے لکھے کروڑوں امریکیوں کو نفسیاتی طور پر ہراس اور خوف میں مبتلا کر کے خود اپنی اقدار کے خلاف قانون سازی کرالی۔ اس جعل سازی کے لیے ''القاعدہ'' بنائی گئی اور استعمال کی گئی۔ اس کے تھک جانے کے بعد تازہ دم ''داعش'' بنائی گئی اور یہ بات ہم جیسے 'مولوی' ہی نہیں کہہ رہے، خود نو منتخب امریکی صدر ٹرمپ کہہ رہا ہے، روسی صدر پیوٹن کہہ رہا ہے اور ہزاروں امریکی اور یورپی تجزیہ کار کہہ رہے ہیں۔

امریکہ نے، یورپ نے، اقوام متحدہ نے، سب نے کہا کہ عراق کیمیائی ہتھیار بنا رہا ہے۔ عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ اس پر دو دفعہ حملہ کیا گیا اور اسے تباہ و برباد کر دیا گیا۔ لاکھوں مسلمان قتل کیے گئے، لاکھوں مسلمان عورتوں کی عزت روندی گئی اور لاکھوں گھر جلائے گئے اور پھر بعد میں خود امریکیوں نے، خود امریکی وزیر خارجہ نے اور برطانوی وزیر اعظم نے 'معصومیت' سے کہہ دیا کہ ہم نے جھوٹ بولا تھا، جو ہم نے کہا وہ محض پروپیگنڈہ تھا۔

خود ہمارے ہاں دیکھ لیجیے۔ بھارت نے علی اعلان مشرقی پاکستان میں مداخلت کی، پاکستان توڑ دیا اور ساری دنیا کھلی آنکھوں دیکھتی رہی۔ جنرل مشرف نے 'غیبی اشارے'' پر کارگل کا ڈرامہ کیا، سول حکومت کو چلتا کیا، پھر ''اتفاقاً'' ۱۱/۹ ہو گیا اور امریکہ نے افغانستان کو کچلنے کا فیصلہ کر لیا (حالانکہ ۱۱/۹ میں ایک بھی افغانی شامل نہ تھا)۔ بہادر، کمانڈو، سید، جنرل، مشرف صاحب نے بیس کروڑ عوام کے مقدر کا فیصلہ امریکی وزارت خارجہ کے ایک اہل کار کی فون کال پر بغیر کسی سے مشورے کے کر دیا۔ وہ بغیر کسی قیمت کے امریکہ کے آگے جھک گئے بلکہ بچھ گئے اور بِک گئے اور اپنے قبائل کے خلاف آپریشن شروع کر دیا۔ حالانکہ ان محب وطن قبائل نے نہ ۱۱/۹ سے پہلے کبھی نفاذ شریعت کے لیے مسلح مزاحمت کی اور نہ بعد میں۔ ان کا اصلی اور بڑا جرم یہ تھا کہ وہ امریکی مزاحمت میں طالبان افغانستان کا ساتھ دیتے تھے۔ بش نے طالبان کے خلاف جنگ کو

''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' قرار دے دیا اور مشرف نے اس جنگ کو اپنی جنگ قرار دے دیا حالانکہ یہ جنگ ہماری تھی، نہ ہے۔ یہ تو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہود اور اہل مغرب کی جنگ تھی اور اب بھی جاری ہے۔ لیکن جنرل مشرف نے اور ان کے بعد آنے والی سیاسی اور عسکری قیادت نے پاکستانی قوم کو علی اعلان بیوقوف بنایا۔

بھارت کراچی، بلوچستان، سرحدی صوبے اور قبائلی علاقے میں جو کچھ کر رہا ہے، وہ پاکستانی حکمرانوں کے لبوں پر طویل برسوں کے بعد آیا۔ بھارتی حکمرانوں نے ''جعلی'' پاکستانی مداخلت کا ڈرامہ رچا کر انتقام کے لیے پشاور کے سکول پر ''ہمارے'' آدمیوں کو استعمال کر کے حملہ کیا جس کے نتیجے میں پاکستان میں ''دینی قوتوں'' کے ہاتھ جکڑے گئے، سیکولرزم اور لبرل ازم کو فروغ دینے والی قوتوں کو کھلی چھوٹ ملی، فوجی قیادت کو سول امور پر حاوی کیا گیا۔ پھر پاکستانی فوج سے وزیرستان آپریشن کرایا گیا۔ امریکہ علی الاعلان قبائلی علاقوں میں پاکستانی فوج کے آپریشن اخراجات کے پیسے دے رہا ہے اور پاکستان لے رہا ہے۔ اسے کیا کہا جائے؟ جب کہ پاکستان کے خلاف دہشت گردی کی ساری کاروائیوں کے پیچھے امریکہ ہی ہے اور وہ بھارت اور افغانستان کو استعمال کر رہا ہے۔ سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ کچھ گروہ اگر نفاذ شریعت کے لیے مسلح جدوجہد کریں تو وہ دہشت گرد اور انتہا پسند ہیں لیکن ہمارے حکمران، فوج، عدلیہ اور بیوروکریسی اگر اسلام نافذ نہ کرنے پر اصرار کرے یا نفاذ شریعت کا مطالبہ کرنے والوں کو قوت سے کچلے تو وہ انتہا پسند کیوں نہیں؟ [اگرچہ ہم نفاذ شریعت کے لیے صرف پر امن جدوجہد کے قائل ہیں اور موجودہ حالات میں خروج کو صحیح نہیں سمجھتے]۔

یہ کیسی دہشت گردی کے خلاف جنگ ہے جو صرف مسلم ممالک کے خلاف ہو رہی ہے؟ عراق، افغانستان، لیبیا کو تباہ کیا جا چکا۔ شام اور یمن کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ پاکستان پر بھی حملے جاری ہیں اور اب ترکی کو بھی لپیٹ میں لیا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ خفیہ نہیں علی الاعلان ہو رہا ہے اور ساری دنیا کے دیکھے یہ بدمعاشی ہو رہی ہے اور کوئی ٹس سے مس نہیں ہوتا اور یوں نبی صادق ﷺ کی پیشین گوئی پوری ہو رہی ہے۔

تعلیم و تربیت　　سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

جدید نظام تعلیم
طلبہ اپنا دین و ایمان بچانے کی فکر کریں[۱]

عزیزانِ من! آپ نے یہاں اپنی زندگی کے بہت سے قیمتی سال صرف کر کے تعلیم حاصل کی ہے۔ بڑی اُمنگوں کے ساتھ آپ اس وقت کا انتظار کر رہے تھے جب کہ آپ کو اپنی محنتوں کا پھل ایک ڈگری کی صورت میں یہاں سے ملنے والا ہے۔ ایسے موقع پر جسے آپ اپنے نزدیک مبارک موقع سمجھتے ہوں گے، آپ کے جذبات کی نزاکت کا مجھے پورا احساس ہے اور اسی لیے آپ کے سامنے اپنے خیالات کا صاف صاف اظہار کرتے ہوئے میرا دل دکھتا ہے۔ مگر میں آپ سے خیانت کروں گا اگر محض نمائشی طور پر آپ کے جذبات کی رعایت کر کے وہ بات آپ سے نہ کہوں جو میرے نزدیک سچی ہے اور جس سے آپ کو آگاہ کرنا اس وقت اور اسی وقت میں ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ اس وقت آپ اپنی زندگی کے ایک مرحلہ سے گزر کر دوسرے مرحلے کی طرف جا رہے ہیں۔ دراصل مَیں آپ کی اس مادر تعلیمی کو اور مخصوص طور پر اسی کو نہیں بلکہ ایسی تمام مادران تعلیم کو درس گاہ کی بجائے قتل گاہ سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک آپ فی الواقع یہاں قتل کیے جاتے رہے ہیں اور یہ ڈگریاں جو آپ کو ملنے والی ہیں، یہ دراصل موت کے صداقت نامے (Death Certificates) ہیں جو قاتل کی طرف سے آپ کو اس وقت دیئے جا رہے ہیں جب کہ وہ اپنی حد تک اس بات کا اطمینان کر چکا ہے کہ اس نے آپ کی گردن کا تسمہ تک لگا رہنے نہیں دیا ہے۔ اب یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ آپ اس منضبط اور منظّم قتل گاہ سے بھی جان سلامت لے کر نکل آئیں۔ مَیں یہاں اس صداقت نامہ موت کے حصول پر آپ کو مبارک باد دینے نہیں آیا ہوں بلکہ آپ کا ہم قوم ہونے کی وجہ سے جو ہمدردی قدرتی طور پر مَیں آپ کے ساتھ رکھتا ہوں وہ مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔ میری مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنے بھائی بندوں کا قتل عام ہو چکنے کے بعد لاشوں کے ڈھیر میں یہ ڈھونڈتا پھرتا ہو کہ کہاں کوئی سخت جان بسمل ابھی سانس لے رہا ہے۔

---

[۱] اسلامیہ کالج کانووکیشن میں طلبہ سے خطاب۔ ماخوذ از ''تعلیمات''۔ یہ تقریر اگرچہ قیام پاکستان سے پہلے کی ہے تاہم تعلیمی حالات آج بھی تقریباً ویسے ہی ہیں۔ عنوان البتہ ہمارا قائم کردہ ہے۔

یقین جانیے، یہ بات مَیں مبالغہ کی راہ سے نہیں کہہ رہا ہوں، اخباری زبان میں 'سنسنی' پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ فی الواقع اس نظامِ تعلیم کے متعلق میرا نقطہ نظر یہی ہے اور اگر مَیں آپ کو تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ میں کیوں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں تو کیا عجب کہ آپ خود بھی مجھ سے اتفاق کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

شاید آپ میں سے ہر شخص اس بات کو جانتا ہو گا کہ اگر کوئی پودا ایک جگہ سے اکھاڑ کر کسی دوسری جگہ لگا دیا جائے جہاں کی زمین، آب وہوا، موسم ہر چیز اس کی طبیعت کے خلاف ہو، تو وہ وہاں کبھی جڑ نہ پکڑ سکے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مصنوعی طور پر اس کے لیے وہی حالات پیدا کر دیے جائیں جو اس کی قدرتی جائے پیدائش میں تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ لیبارٹری کی مصنوعی زندگی ہر پودے کو تمام عمر کے لیے میسر نہیں آسکتی۔ اس غیر معمولی صورتِ حال کو نظر انداز کر دینے کے بعد یہ کہنا بالکل صحیح ہو گا کہ کسی پودے کو اس کی اصل جائے پیدائش سے اکھاڑنا اور ایک مختلف قسم کے ماحول میں لے جا کر لگا دینا دراصل اسے ہلاک کر دینا ہے۔

اچھا اب ذرا اس بدقسمت پودے کی حالت کا اندازہ کیجیے جو اپنی زمین سے اکھاڑا نہیں گیا، اپنے ماحول سے نکالا بھی نہیں گیا، وہی زمین ہے، وہی آب وہوا، وہی موسم ہے جس میں وہ پیدا ہوا تھا، مگر سائنٹفک طریقوں سے خود اس کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کر دی گئی کہ وہیں اپنی ہی جائے پیدائش میں اس کی طبیعت اس زمین، اس آب وہوا اور اس موسم سے بے لگاؤ اور بے گانہ ہو کر رہ گئی۔ اور وہ اس قابل نہ رہا کہ اس میں اپنی جڑیں پھیلا سکے۔ اس ہوا اور پانی سے غذا حاصل کر سکے اور اس موسم میں پھل پھول سکے، اس اندرونی تغیر کی وجہ سے وہ بعینہٖ ایسا ہو گیا جیسے کسی دوسری زمین کا پودا ہے اور اجنبی ماحول میں لا کر لگا دیا گیا ہے۔ اب وہ اس کا محتاج ہو گیا ہے کہ اس کے گرد مصنوعی فضا تیار کی جائے اور مصنوعی طور پر اس کی زندگی کا سامان کیا جائے۔ یہ لیبارٹری کی زندگی اگر اسے بہم نہ پہنچے تو وہ جہاں پیدا ہوا تھا وہیں کھڑے کھڑے زمین چھوڑ دے گا اور مرجھا کر رہ جائے گا۔

پہلا فعل یعنی ایک پودے کو اکھاڑ کر اجنبی ماحول میں لگانا چھوٹے درجہ کا ظلم ہے اور دوسرا فعل یعنی ایک پودے کو اسی جگہ جہاں وہ پیدا ہوا ہے اپنے ماحول سے اجنبی بنا دینا اس سے عظیم تر ظلم ہے۔ اور جب ایک دو نہیں لاکھوں پودوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جا رہا ہو اور اتنے کثیر التعداد

پودوں کے لیے لیبارٹری کی مصنوعی فضا بہم پہنچنا محال ہوتو بے جانہ ہوگا اگر اسے ظلم کی بجائے قتل عام کہا جائے۔

حقیقی صورتِ حال کا جو مطالعہ مَیں نے کیا ہے وہ مجھے بتا تا ہے کہ ان درسگاہوں میں آپ کے ساتھ یہی کچھ ہورہا ہے۔آپ اس ملک کی سرزمین میں مسلم سوسائٹی کے اندر پیدا ہوئے۔یہی زمین، یہی تمدنی آب وہوا اور یہی تہذیبی ماحول ہے جس کی پیداوار آپ ہیں۔آپ کے نشوونما پانے اور پھل پھول لانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اسی زمین میں جڑیں پھیلائیں اور اسی آب وہوا سے زندگی کی طاقت حاصل کریں۔اس ماحول سے آپ کی جتنی زیادہ مناسبت ہوگی اسی قدر زیادہ بالیدگی آپ کو نصیب ہوگی اور اسی قدر زیادہ آپ اس چمن کی بہار میں اضافہ کریں گے۔مگر واقعہ کیا ہے؟ یہاں جو تعلیم اور تربیت آپ کو ملتی ہے، جو ذہنیت آپ کے اندر پیدا ہوتی ہے، جو خیالات، جذبات اور داعیات آپ کے اندر پرورش پاتے ہیں، جو عادات واطوار اور خصائل آپ میں راسخ ہوتے ہیں اور جس طرزِ فکر، رنگ طبیعت اور طریق زندگی کے سانچے میں آپ ڈھالے جاتے ہیں کیا وہ سب مل جل کر اس زمین، اس آب وہوا اور اس موسم سے مناسبت بھی آپ کے اندر باقی رہنے دیتے ہیں؟ یہ زبان جو آپ بولتے ہیں، یہ لباس جو آپ پہنتے ہیں، یہ طرزِ زندگی جو آپ اختیار کرتے ہیں، یہ نظریات اور افکار جو آپ اس تعلیم سے حاصل کرتے ہیں، ان سب چیزوں کو آخر کون سا لگاؤ آپ کے ان کروڑوں بھائیوں کے ساتھ ہے جن کے درمیان آپ کا جینا اور مرنا ہے اور اس تمدن کے ساتھ جو آپ کے چاروں طرف چھایا ہوا ہے۔آپ کی شخصیت اس ماحول میں کس قدر بیگانہ ہے اور ماحول آپ کی شخصیت کے لیے کتنا اجنبی ہے؟ کاش آپ کے اندر اتنی حس باقی رہنے دی گئی ہوتی کہ اس بیگانگی اور اس کی اذیت کو محسوس کرسکتے۔

آپ اتنا تو بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ خام اشیاء کو صنعت اور کاریگری سے تیار کرنے کا مدعا یہی ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے لیے کارآمد اور مفید بن سکیں۔جو چیز اس طرح تیار کی گئی ہو کہ اسے یہ مدعا حاصل نہ ہوسکے، وہ خود بھی ضائع ہوئی اور اس پر کاریگری بھی فضول صَرف کی گئی۔کپڑے پر خیاطی کی قابلیت اسی لیے صَرف کی جاتی ہے کہ جسم پر وہ راست آئے، یہ بات حاصل نہ ہوئی تو اس کاریگری نے کپڑے کو بنایا نہیں، بگاڑ دیا۔خام جنس پر طباخی کا فن صَرف کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ کھانے کے قابل ہوجائے۔اگر وہ کھانے ہی کے قابل نہ ہوئی تو باورچی نے اسے ضائع

کیا نہ کہ بنایا۔ بالکل اسی طرح تعلیم کا مدعا بھی یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں جن نئے انسانوں نے جنم لیا ہے اور جو جبلی صلاحیتیں (potentialities) ابھی خام حالت میں ہیں ان کو بنا سنوار کر اور بہتر طریقہ پر نشوونما دے کر اس قابل بنا دیا جائے کہ جس سوسائٹی نے انہیں جنم دیا ہے وہ اس کے مفید اور کارآمد فرد بن سکیں اور اس کی زندگی کے لیے بالیدگی اور فلاح وترقی کا ذریعہ ہوں۔ مگر جو تعلیم افراد کی اپنی سوسائٹی اور اس کی حقیقی زندگی سے اجنبی بنا دے، اس کے حق میں اس کے سوا آپ اور کیا فتویٰ دے سکتے ہیں کہ وہ افراد کو بناتی نہیں بلکہ ضائع کرتی ہے؟ ہر قوم کے بچے دراصل اس کے مستقبل کا محضر ہوتے ہیں، قدرت کی طرف سے یہ محضر ایک لوح سادہ کی شکل میں آتا ہے اور قوم کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خود اس پر اپنے مستقبل کا فیصلہ لکھے۔ ہم وہ دیوالیہ قوم ہیں جو اس محضر پر اپنے مستقبل کا فیصلہ خود لکھنے کی بجائے اسے دوسروں کے حوالہ کر دیتے ہیں کہ وہ اس پر جو چاہیں ثبت کر دیں خواہ وہ ہماری اپنی موت ہی کا فتویٰ کیوں نہ ہو۔

جب آپ کوئی کپڑا سلواتے ہیں اور وہ آپ کے جسم پر راست نہیں آتا تو مجبوراً اسے مارکیٹ میں لے جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اونے پونے بیچ کر کچھ دام ہی سیدھے کر لیں۔ اگر کپڑا کوئی ذی شعور ہستی ہو تو وہ خود بھی اپنا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں سوچ سکتا کہ کہیں نہ کہیں اس کے سے ناپ اور اس کی سی تراش خراش کے کپڑے کی مانگ ہو تو وہ وہاں کھپ جائے۔ جب تک کسی جسم پر وہ راست نہ آئے گا، نیلام گھروں اور کباڑ خانوں میں مارا مارا پھرتا رہے گا۔ ایسا ہی حال ان لوگوں کا بھی ہے جو ان درسگاہوں سے تیار ہو کر نکلتے ہیں۔ جس سوسائٹی نے انہیں تیار کرایا ہے اس کے پاس جب یہ تیار ہو کر واپس پہنچتے ہیں تو وہ بھی محسوس کرتی ہے اور یہ خود بھی محسوس کرتے ہیں کہ اس کے تمدن اور اس کی زندگی کے لیے ٹھیک نہیں بنے۔ جس طرح معدہ اس غذا کو قبول نہیں کرتا جو اس کے لیے مناسب نہ ہو، اسی طرح سوسائٹی بھی طبعی طور پر ان افراد کو اپنے اندر کھپا نہیں سکتی جو اس کے لیے مناسب نہ ہوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو اپنے کسی کام کا نہ پا کر نیلام کے لیے پیش کر دیتی ہے اور یہ خود بھی اپنی زندگی کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں سمجھتے کہ کہیں بِک جائیں۔ آپ غور تو کیجیے کس قدر خسارے میں ہے وہ قوم جو اپنی بہترین انسانی متاع دوسروں کے ہاتھ بیچتی ہے؟ ہم وہ ہیں جو انسان دے کر جوتا، کپڑا اور روٹی حاصل کرتے ہیں! قدرت نے جو انسانی طاقت (Man Power) اور دماغی طاقت (Brain Power) ہم کو خود ہمارے اپنے

کام کے لیے دی تھی وہ دوسروں کے کام آتی ہے۔ ان کے ہٹے کٹے جسموں میں جو قوت بھری ہوئی ہے ان بڑے سروں میں جو قابلیتیں بھری ہوئی ہیں، ان چوڑے چکلے سینوں میں جو دل طرح طرح کی طاقتیں رکھتے ہیں جنہیں خدا نے ہمارے لیے عطا کیا تھا، ان میں سے بمشکل ایک دو فیصد ہمارے کام آتے ہیں، باقی سب کو دوسرے خرید لے جاتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس خسارے کی تجارت کو ہم بڑی کامیابی سمجھ رہے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا اصل سرمایۂ زندگی تو یہی انسانی طاقت ہے، اس لیے اسے بیچنا نفع کا سودا نہیں بلکہ سراسر خسارہ کا سودا ہے۔

مجھے بکثرت ایسے نوجوانوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے جو اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں یا تازہ تازہ فارغ ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے مَیں یہ تحقیق کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنی زندگی کا کوئی مقصد بھی معین کیا ہے یا نہیں؟ مگر میری مایوسی کی انتہا نہیں رہتی جب مَیں دیکھتا ہوں کہ مشکل سے ہزاروں میں کوئی ایک ایسا ملتا ہے جو اپنے سامنے زندگی کا کوئی مقصد رکھتا ہو بلکہ بیشتر اصحاب ایسے ہیں جن کے ذہن میں اس امر کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی مقصد بھی ہونا چاہیے یا ہوسکتا ہے۔ مقصد کے سوال کو وہ محض ایک فلسفیانہ یا شاعرانہ مسئلہ سمجھتے ہیں اور عملی حیثیت سے یہ طے کرنے کی کوئی ضرورت ان کو محسوس نہیں ہوتی کہ آخر دنیا کی زندگی میں ہماری کوششوں اور محنتوں کا، ہماری دوڑ دھوپ کا کوئی منتہا (Goal) اور کوئی مقصود بھی ہونا چاہیے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی یہ حالت دیکھ کر میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ مَیں حیران ہو کر سوچنے لگتا ہوں کہ اس نظامِ تعلیم کو کس نام سے یاد کروں، جو پندرہ بیس سال کی مسلسل دماغی تربیت کے بعد بھی انسان کو اس قابل نہیں بناتا کہ وہ اپنی قابلیتوں کا کوئی مصرف اور اپنی کوششوں کا کوئی مقصود متعین کر سکے۔ بلکہ زندگی کے لیے کسی نصب العین کی ضرورت ہی محسوس کر سکے۔ یہ انسانیت کو بنانے والی تعلیم ہے یا اس کو قتل کرنے والی؟ بے مقصد (Aimless) زندگی بسر کرنا تو حیوانات کا کام ہے۔ اگر آدمی بھی صرف اس لیے جئے کہ جینا ہے اور اپنی قوتوں کا مصرف بقائے نفس اور تناسل کے سوا کچھ نہ ہو تو آخر اس میں اور دوسرے حیوانات میں کیا فرق باقی رہا؟

میری اس تنقید کا ہرگز یہ مدعا نہیں ہے کہ آپ کو ملامت کروں۔ ملامت تو قصوروار کو کی جاتی ہے اور آپ قصوروار نہیں بلکہ مظلوم ہیں۔ اس لیے میں دراصل آپ کی ہمدردی میں یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اب جو آپ زندگی کے عملی میدان میں قدم رکھنے کے لیے جا رہے ہیں

تو پوری طرح اپنا جائزہ لے کر دیکھ لیں کہ فی الواقع اس مرحلہ پر آپ کس پوزیشن میں ہیں، آپ ملت اسلام کے افراد ہیں۔ یہ ملت کوئی نسلی قومیت نہیں ہے کہ جو اس میں پیدا ہوا ہو، وہ آپ سے آپ مسلم ہو۔ یہ محض ایک تمدنی گروہ (Cultural Group) کا نام بھی نہیں ہے جس کے ساتھ محض معاشرتی حیثیت سے وابستہ ہونا مسلم ہونے کے لیے کافی ہو۔ دراصل اسلام ایک مخصوص نظامِ فکر (Ideology) کا نام ہے، جس کی بنیاد پر تمدنی زندگی اپنے تمام شعبوں او پہلوؤں کے ساتھ تعمیر ہوتی ہے۔ اس ملت کی بقا صرف اس بات پر منحصر ہے کہ جو افراد اس میں شامل ہوں وہ اس کے نظام فکر کو سمجھتے ہوں، اس کی روح سے آشنا ہوں اور اپنی تمدنی زندگی کے ہر شعبہ میں اس روح کی عملی تفسیر و تعبیر پیش کرنے پر قادر ہوں۔ خصوصیت کے ساتھ ملت کے اہل دماغ طبقہ (Intelligentia) کے لیے تو سب سے بڑھ کر اس علم وفہم اور اس عمل کی ضرورت ہے کیونکہ یہی طبقہ ملت کا رہنما اور پیش رو ہے۔ اگرچہ ہر قوم اور ہر گروہ کو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کا اہل دماغ طبقہ اس کی مخصوص قومی تہذیب کے رنگ میں پوری طرح رنگا ہوا ہو، لیکن ملت اسلامیہ کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے کیونکہ یہاں ہماری انفرادیت کی اساس نہ خاک ہے نہ خون، نہ رنگ ہے نہ زبان، نہ کوئی اور مادی چیز، بلکہ صرف اسلام ہے۔ ہمارے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ ہماری ملت کے افراد اور خصوصاً اہل دماغ طبقے، اسلامی طرز فکر اور اسلامی طرز عمل کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ اس لحاظ سے ان کی تعلیم و تربیت میں جتنی اور جیسی کمزوری ہوگی اس کا عکس ہماری ملت کی زندگی میں جوں کا توں نمودار ہوگا، اور اگر وہ اس سے بالکل خالی ہوں تو یہ دراصل ہماری موت کا نشان ہوگا۔

یہ وہ حقیت ہے کہ جس سے یہاں کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ مگر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں ملت اسلام کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جو انتظام کیا جاتا ہے، وہ دراصل ان کو اس ملت کی پیشوائی کے لیے نہیں بلکہ اس کی غارت گری کے لیے تیار کرتا ہے؟ ان درسگاہوں میں آپ کو فلسفہ، سائنس، معاشیات، قانون، سیاسیات، تاریخ اور دوسرے وہ تمام علوم پڑھائے جاتے ہیں جن کی مارکیٹ میں مانگ ہے، مگر آپ کو اسلام کے فلسفے، اسلام کی تاریخ اور فلسفہ تاریخ کی ہوا تک نہیں لگنے پاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کے ذہن میں زندگی کا پورا نقشہ اپنی تمام جزئیات اور تمام پہلوؤں کے ساتھ بالکل غیر اسلامی خطوط پر بنتا ہے۔ آپ غیر

اسلامی طرز پر سوچنے لگتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر کبھی آپ کے سامنے آتا ہی نہیں، منتشر طور پر کچھ معلومات اسلام کے متعلق آپ تک پہنچتی ہیں مگر وہ غیر مستند اور بسا اوقات غلط اوہام وخرافات کے ساتھ ملی جلی ہوتی ہیں۔ ان معلومات سے اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ آپ ذہنی طور پر اسلام سے زیادہ دور ہوجاتے ہیں۔ آپ میں سے جو لوگ محض آبائی مذہب ہونے کی وجہ سے اسلام کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے ہیں وہ دماغی طور پر غیر مسلم ہوجانے کے باوجود کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو سمجھاتے رہتے ہیں کہ اسلام حق تو ضرور ہوگا اگرچہ سمجھ میں نہیں آتا اور جو لوگ اس عقیدت سے بھی خالی ہو چکے ہیں وہ اسلام پر اعتراض کرنے اور اس کا مذاق اُڑانے سے بھی نہیں چوکتے۔

اس قسم کی تعلیم پانے کے ساتھ عملاً جو تربیت آپ کو میسر آتی ہے جس ماحول میں آپ گھرے رہتے ہیں اور عملی زندگی کے جن نمونوں سے آپ کو واسطہ پیش آتا ہے ان میں مشکل ہی سے کہیں اسلامی کیریکٹر اور اسلامی طرزِ عمل کا نشان پایا جاتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو نہ عملی حیثیت سے اسلام کی واقفیت بہم پہنچائی گئی ہو، نہ عملی حیثیت سے اسلامی تربیت دی گئی ہو، وہ فرشتے تو نہیں ہیں کہ خود بخود مسلمان بن کر اٹھیں، ان پر وحی نازل تو نہیں ہوتی کہ خود بخود ان کے دل میں علم دین ڈال دیا جائے۔ وہ پانی اور ہوا سے تو اسلامی تربیت اخذ نہیں کر سکتے۔ اگر وہ فکر اور عمل دونوں حیثیتوں سے غیر اسلامی شان رکھتے ہیں تو یہ ان کا قصور نہیں بلکہ ان درسگاہوں کا قصور ہے جو موجودہ نظامِ تعلیم کے تحت قائم کی گئی ہیں۔ درحقیقت یہ میرا وجدان ہے، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، کہ ان درسگاہوں میں دراصل آپ کو ذبح کیا جاتا ہے اور اس ملت کی قبر کھودی جاتی ہے جس کے نونہال آپ ہیں۔ آپ نے جس سوسائٹی میں جنم لیا ہے جس کے خرچ پر تعلیم پائی ہے، جس کی فلاح کے ساتھ آپ کی فلاح اور جس کی زندگی کے ساتھ آپ کی زندگی وابستہ ہے، اس کے لیے آپ بیکار بنا کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ آپ کو صرف یہی نہیں کہ اس کی فلاح کے لیے کام کرنے کے قابل نہیں بنایا گیا بلکہ دراصل آپ کو باضابطہ اور منظّم طریقہ پر ایسا بنا دیا گیا ہے کہ بلاارادہ آپ کی ہر حرکت اس ملت کے لیے فتنہ سامان ہو، حتیٰ کہ آپ اس کی خیر خواہی کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیں تو وہ اس کے حق میں مضر ثابت ہو، اس لیے کہ آپ اس کی فطرت سے بے خبر اور اس کے ابتدائی اصولوں تک سے بیگانہ رکھے گئے ہیں اور آپ کی پوری دماغی تربیت اس نقشہ پر کی گئی

ہے جو ملت اسلامیہ کے نقشہ کے بالکل برعکس ہے۔

اپنی اس پوزیشن کو اگر آپ سمجھ لیں اور اگر آپ کو پوری طرح احساس ہو جائے کہ فی الواقع کس قدر خطرناک حالت کو پہنچا کر اب آپ کو کارزارِ زندگی کی طرف جانے کے لیے چھوڑا جا رہا ہے تو مجھے یقین ہے کہ آپ کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات کی کوشش ضرور کریں گے۔ پوری تلافی تو شاید اب بہت ہی مشکل ہے تاہم میں آپ کو تین باتوں کا مشورہ دوں گا جن سے آپ کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

۱۔ جہاں تک ممکن ہو عربی زبان سیکھنے کی کوشش کیجیے، کیونکہ اسلام کا ماخذ اصلی یعنی قرآن اسی زبان میں ہے اور اس کو جب تک آپ اس کی اپنی زبان میں نہ پڑھیں گے اسلام کا نظام فکر کبھی آپ کی سمجھ میں پوری طرح نہ آ سکے گا۔ عربی زبان کی تعلیم کا پرانا ہولناک طریقہ اب غیر ضروری ہو گیا ہے۔ جدید طرز تعلیم سے آپ چھ مہینے میں اتنی عربی سیکھ سکتے ہیں کہ قرآن کی عبارت سمجھنے لگیں۔

۲۔ قرآن مجید، سیرت رسول ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی کا مطالعہ اسلام کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے، جہاں آپ نے اپنی زندگی کے ۱۲۔۱۵ سال دوسری چیزوں کے پڑھنے میں ضائع کیے ہیں وہاں اس سے آدھا بلکہ چوتھائی وقت ہی اس چیز کے سمجھنے میں صرف کر دیجیے جس پر آپ کی ملت کی اساس قائم ہے اور جس کو جانے بغیر آپ اس ملت کے کسی کام نہیں آ سکتے۔

۳۔ جو کچھ بھلی یا بری رائے آپ نے ناکافی اور منتشر معلومات کی بنا پر اسلام کے متعلق قائم کر رکھی ہے، اس سے اپنے ذہن کو خالی کر کے اس کا باقاعدہ مطالعہ (Systematic Study) کیجیے۔ پھر جس رائے پر بھی آپ پہنچیں گے وہ قابل وقعت ہوگی۔ تعلیم یافتہ آدمیوں کے لیے یہ کسی طرح موزوں نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کے متعلق کافی معلومات حاصل کیے بغیر وہ کوئی رائے قائم کریں۔ اب میں اس دعا کے ساتھ اپنا یہ خطبہ ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے اور آپ کو اس خطرے سے بچائے جس میں آپ پھنسا دیئے گئے ہیں۔

تعلیم و تربیت　　ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ

دینی تعلیم کی موجودہ صورت حال
اور مسلم برصغیر کی تعلیمی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر

عہد حاضر میں دینی مدارس کی تعلیم مشرق و مغرب دونوں میں گرما گرم بحث کا موضوع ہے، دوست و دشمن دونوں کی طرف سے اس کے حق اور مخالفت میں گفتگو جاری ہے۔ مغربی میڈیا مدرسے کو ایک مختلف انداز سے پیش کر رہا ہے جو حقیقت سے بعید ہے۔ اس کے ہاں مدرسے کی تصویر کو گہنا کر مسلم تاریخ میں اس کے مثبت کردار کو مسخ کر دیا گیا ہے۔

لغت میں مدرسے کا مطلب ہے: تعلیم یا تدریس کی جگہ۔ یہ ادارہ اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی سے وجود پذیر ہو گیا تھا جس نے علم، فکر و دانش اور سائنسی پیش رفت کے معاملے میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے کردار کی نمائندگی کی۔ مدرسے نے تاریخ میں پہلی مرتبہ تعلیم اور علم کی وحدت کے تصور کو اُجاگر کیا۔ انسانی علم و فکر کی تاریخ میں مدرسہ سے اور اس کے ساتھ وابستہ شخصیات نے وحدت علم کا یہ تصور پیش کیا، جہاں عقل و وحی ایک کل کی حیثیت سے باہم وگر مربوط ہیں۔ یہاں روایتی دینی علم جدید ترین انسانی دریافتوں کے ساتھ مشترکہ انسانی یافت کی حیثیت سے ہم آہنگ ہے۔ اس تصور کے تحت یونانیوں سے متوارث نام نہاد عقلی علوم کے ساتھ ایسا تعامل کیا گیا کہ آخر کار وہ اسلام کے بنیادی اور سرمدی اصولوں کے خادم بن کر رہ گئے۔ ابونصر فارابی، جسے تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں منطق اور مسلم فکر کی تنظیم میں کردار ادا کرنے پر مسلمانوں نے معلم ثانی کے لقب سے یاد کیا ہے، اس جیسے لوگوں نے عموماً سب سے پہلے عقل و وحی کی وحدت اور علم کو ایک کُل کی حیثیت سے منضبط طور پر پیش کرنے میں غیر معمولی کاوشیں کیں۔ اس سے وحی اور انسانی مشاہدے اور عقل پر مبنی علم باہم مربوط اور متناسب وحدت کے طور پر سامنے آئے۔ فارابی اور اس کے ہم عصر حضرات ان کوششوں میں کس حد تک کامیاب ہوئے، اس پر کلام ہو سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ کاوشیں، جن کی وجہ سے مدرسہ وحدت علم کی علامت بن کر سامنے آیا وہ مسلمانوں کی فکری روایت اور مدرسے میں حقیقت کی وحدت کو نمایاں کیا گیا، ان کاوشوں کا سہرا ان ہی حضرات کے سر بندھتا ہے۔

یہ روایت، جس کا آغاز فارابی اور اس کے ہم عصر حضرات کے ہاتھوں نہیں بلکہ اس سے بھی پہلے صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین کے ہاتھوں ہوا تھا، گیارہ سو سال سے بھی زیادہ عرصے جاری رہی۔ ان گیارہ سو سالوں میں علم نے جس کی نمائندگی مسلم علماء نے مدرسے میں کی تھی، انسانی فکر اور علم کی ایک عالم گیر متوازی وحدت کی نمائندگی کی۔ ماہرین سائنس، معروف ماہر طبیعیات ابن سینا جیسے لوگوں، محدثین، مفسرین، فقہاء، علماء، فلاسفہ وغیرہ حضرات نے ایک ہی چھت کے نیچے تعلیم وتربیت پائی۔ مسلم ہندوستان کی نامور عبقری شخصیت، جن کا تذکرہ علامہ اقبالؒ نے بھی کیا ہے، مدرسے ہی کی دین تھی۔ اقبال نے شیخ احمد سرہندیؒ کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے عبقری تھے۔ نواب سعد اللہ خان کئی عشروں پر مشتمل ایک طویل عرصے تک عظیم مسلم مغلیہ سلطنت کے (جو آج کے افغانستان، پاکستان، کشمیر، انڈیا، نیپال، بنگلا دیش، برما اور سری لنکا کے بعض حصوں پر مشتمل تھی) وزیر اعظم رہے ہیں۔ استاد احمد معمار، جو سات عجائباتِ عالم میں سے ایک تاج محل کے معمار ہیں۔ یہ تینوں شخصیات آپس میں ہم جماعت تھیں اور ایک ہی مدرسے کی تربیت یافتہ تھیں۔

اس مثال سے واضح ہے کہ کس طرح انسانی دریافتوں اور فکری تکمیل کے سلسلے میں وحدتِ علم کا ظہور ہوا۔ فن تعمیر، علمی و دینی فکر اور انتظام و انصرام کے شعبہ جات میں ہندوستان کی نہایت بلند پایہ شخصیات مدرسے ہی کی پیداوار تھیں۔

مسلم ہندوستان میں تعلیمی روایت مختلف مدارج سے گزر کو متنوع ابعاد کی شکل میں ڈھلی ہے۔ ایک وقت تھا کہ برصغیر میں مسلم انتظام کا دائرہ آج کے پاکستان، وادیٔ سندھ، ملتان اور اس کے گرد کے علاقے تک محدود تھا۔ برصغیر کی مسلم تاریخ میں یہ عرب دور تھا جب ہندوستان کی روایات عرب مراکز علم، کوفہ، بصرہ، بغداد، دمشق، مکہ اور مدینہ کے ساتھ وابستہ تھیں۔ یہ جگہیں تعلیم و تعلم کا مرکز تھیں جہاں برصغیر کے اصحاب علم اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے گئے اور اپنے متعلقہ میدانوں میں اعلیٰ مقامات کا حصول کیا۔ علماء کی ایک کھیپ ہے جن کے فقہ، سیرت، حدیث، عربی ادب وغیرہ میدانوں میں کردار کا اعتراف شرق اوسط، عراق، عرب اور شام کے علماء نے بھی کیا ہے۔ عربی شاعری کا منتخب مجموعے حماسہ میں ان حضرات کے قطعات اور نظمیں بھی شامل ہیں، جن کا تعلق سندھ سے تھا۔ ابو عطا سندھی اسی طرح کے ایک عالم تھے جن کی بعض سطور ابو تمام نے منتخب

عربی شاعری کے اس مشہور مجموعے میں شامل کی ہیں۔اس سے عربی فہمی اور عربی کے بحیثیت ایک مشترک زبان کے استعمال سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس سطح پر پہنچ چکی تھی جس سے ابوعطا سندھی جیسا شاعر پیدا ہوسکے۔

عرب علمی روایات کی اصطلاح کے اعتبار سے اس کمال کی ایک مثال ابومعشر نجیب سندھی کی ہے، جو سیرت اور حدیث میں اپنے کردار کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔اس نوعیت کی مثالیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کو نقل نہیں کیا جاسکتا۔ برصغیر کی علمی تاریخ میں یہ دور تقریباً چار صدیوں تک جاری رہا۔ وسط ایشیا اور افغانستان سے آنے والے لوگ اس کے وارث بنے اور ساتویں صدی میں قطب الدین ایبک کے ہاتھوں سلطنت دہلی کے قیام نے برصغیر میں اسلامی تعلیم کو ایک نئی اٹھان بخشی۔اب عرب دنیا کے ساتھ تعلقات شروع میں تو کمزور ہوئے اور پھر تقریباً ختم ہوکر رہ گئے۔اب تعلقات افغانستان اور وسط ایشیا کے ساتھ قائم ہوئے۔اب روایات کو افغانستان اور وسط ایشیا سے درآمد کیا جارہا تھا،جن میں زیادہ زور فقہ، اصول،عربی زبان اور اس کی گرامر پر دیا گیا۔اسی عہد میں مختلف فنون کے روایتی اور مختصر متون کو ہندوستان میں لایا گیا، جو دہلی اور دنیا کے مختلف حصوں کے مدارس میں قائم تعلیم وتدریس کا موضوع بن گئے۔اشاعت علم اور علمی سرگرمیوں کے پھیلاؤ کے اعتبار سے یہ عہد ہندوستان کی دینی تعلیم کی تاریخ کا زریں عہد ہے۔

ساتویں صدی ہجری میں جب ابن بطوطہ نے ہندوستان کا سفر کیا تو اس نے دیکھا کہ صرف دہلی میں ایک ہزار سے زائد مدارس تھے،جن میں اعلیٰ تعلیم ہوتی تھی۔اس نے دنیا کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے علماء کا مشاہدہ کیا۔اس کی ملاقات شیخ عبدالعزیز اردبیلی سے ہوئی جو شام سے محمد تغلق کی دعوت پر آئے تاکہ ہندوستان میں ایک مدرسہ قائم کریں۔ یہاں تقریباً ہر قصبے اور گاؤں میں مدارس تھے جو نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں میں بھی اشاعت علم کا فریضہ انجام دیتے تھے۔

یوں مدرسے کا کردار صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا دائرہ ہندوؤں، بدھوں اور دوسروں تک بھی رہا ہے۔ابھی تک ہندوؤں کی روایت کے مطابق علم دو مختلف گروہوں میں محدود رہا ہے۔ مذہبی علم ایک مخصوص طبقے میں محدود جب کہ دنیوی علم ایک دوسرے طبقے میں خاص تھا۔ ہندو معاشرے کے دیگر طبقات کو کسی قسم کے علم تک رسائی کی کوئی اجازت نہیں تھی۔ وہاں مختلف طبقات تھے۔شودر طبقے کو نہ صرف نظرانداز کیا جاتا تھا بلکہ اگر اس طبقے کا کوئی فرد

بلاارادہ بھی علم تک رسائی حاصل کرلیتا تو اس کا یہ عمل جرم اور گناہ تصور کیا جاتا تھا اور اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال کر سزادی جاتی تھی۔ یہ قانون ان کی مذہبی کتابوں کی دین تھا۔ مدرسے نے پہلی بار ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں (سکھ وہاں نہیں تھے بعد کے دور میں ایسا ہوا) جین مت کے پیروکاروں اور بدھوں کے لیے بھی علم کا در وا کیا۔ یہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ ہندوؤں کے تمام طبقوں نے علم حاصل کیا۔ وہ فارسی زبان کے ماہر بنے جو اس وقت عدالت، ثقافت اور بازار کی زبان تھی۔ بدھ، فارسی اور اسلامی قانون کے ماہر بنے۔ بہت سے ہندو، بدھ اور دیگر مذاہب کے اہل علم ایسے ہیں جنہوں نے مدرسے کی بدولت مختلف علوم وفنون میں اپنا اثر چھوڑا ہے۔ تاہم اس عہد میں مدرسے کا ایک منفی پہلو یہ نظر آتا ہے کہ اس میں اشاعت علم اور آزادانہ تحقیق ومطالعے کے باب میں دلچسپی کمیاب یا نایاب نظر آتی ہے۔ اب علم کا زیادہ ارتکاز ان متون پر تھا، جو وسط ایشیائی یا عرب ممالک میں کہیں تیار ہوئے۔ اصول فقہ، فقہ، منطق اور فلسفے کے متون ہندوستان برآمد کیے گئے اور ان کو درسی کتابوں کی حیثیت دے دی گئی۔

ہندوستان کے مسلمان علماء کا حصہ، جو کہ کمیت میں بڑا تھا لیکن شروحات ہی تک محدود تھا، شروحات اور وسط ایشیا یا عرب دنیا سے آئے ہوئے متون پر حواشی پر مشتمل تھا۔ یہ حصہ حواشی پر حواشی اور پھر ان پر مزید حواشی پر مشتمل تھا۔ کئی کتابیں اس کی مثال ہیں کہ جب آپ کتاب کھولتے ہیں تو ایک گونہ پریشانی ہوتی ہے کہ کتاب سے کس طرح استفادہ کیا جائے؟ بیک وقت ایک ہی صفحے پر آپ کو دس یا بعض اوقات اس سے بھی زیادہ متون مل جائیں گے جو باہم دگر مخلوط ہوتے ہیں۔ اصل متن، شرح، شرح کی شرح، شرح کی شرح کی شرح، پہلی شرح پر حواشی، دوسری شرح پر حواشی، تیسری شرح پر حواشی، حوشی پر حواشی۔ یہ وہ میدان تھا جو علماء کی تگ وتاز کا مرکز تھا۔ کوئی شک نہیں کہ یہ ایک علمی سرگرمی اور مصنفین کی عالی دماغی اور اذہان رسا کا عکس تھا، لیکن اس سب کچھ میں ان کی توجہ کتاب کی لفظی موشگافیوں پر مرتکز تھی، خود علم کی خدمت اس اسلوب نے کم ہی کی۔ اس چیز نے مختلف اسلامی علوم وفنون کی نشوونما میں کمی کے رجحان کو جنم دیا۔ ابتدائی عہد کے مسلمان علماء نے جو کچھ پانچویں یا چھٹی صدی تک کرلیا تھا اس میں بہت کم مزید حصہ ڈالا گیا یا پیش رفت کی گئی۔ (جاری ہے)

میڈیا　　پروفیسر عاصم حفیظ(۱)

بندے غائب کرنے (Missing Persons) کے نام پر لبرلز اور سیکولرسٹوں کا واویلا

اسلام دشمن بلاگرز شکنجے میں

حکومت کا امتحان اور دینی قوتوں کی مجرمانہ خاموشی

آج تک امریکی دباؤ پر طالبان کی مزعومہ حمایت اور سہولت کاری کے الزام میں پاکستان میں علماء کرام اور دینی مدارس ومساجد کی سختی آئی ہوئی تھی لیکن اب ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک منظم گروہ کے ارکان گرفتار ہوئے ہیں جو ایسے سوشل میڈیا نیٹ ورک چلا رہے تھے جن کے ذریعے ذات باری تعالی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کے بارے میں توہین آمیز اور غلیظ ترین مواد شائع کیا جاتا تھا۔شاید بہت سے پاکستانیوں کے لئے یہ کسی انکشاف سے کم نہ ہو کہ کچھ عرصہ قبل ہم ڈنمارک اور دیگر یورپی ممالک میں توہین آمیز کارٹونز کی اشاعت پر احتجاج کر رہے تھے لیکن اب ایسے ہی کارٹون اور توہین آمیز مواد بیرونی اشیر باد سے پاکستان کے اندر دھڑلے سے تیار بھی ہو رہا ہے اور بے باکی سے انٹرنیٹ پر شائع بھی کیا جاتا ہے۔

یہ سوشل میڈیا نیٹ ورک چلانے والوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو تعلیم یا کسی اور سلسلے میں بیرون ملک گئے اور واپسی پر ملحدانہ نظریات اور اسلام مخالف جذبات لے کر ساتھ آئے۔ یہ لوگ اردو زبان میں ذات باری تعالی، اسلامی طرز معاشرت، دینی احکام اور مقدس ہستیوں کے بارے میں توہین آمیز مواد تیار کر کے فیس بک اور دیگر سوشل میڈیا ویب سائٹس کے ذریعے پھیلانے میں ملوث تھے۔ملک کے اندر اس گروہ سے منسلک افراد نے سول سوسائٹی کے طور پر پہچان بنائی ہوئی ہے۔اس گروپ کی جڑیں ملک کے اندر کس قدر مضبوط ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سلمان حیدر اسلام آباد کی ایک بڑی یونیورسٹی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر کام کر رہے تھے۔اسی طرح وقاص گورایہ اور ایسے ہی چند مزید افراد گرفتار ہوئے ہیں جو کہ "بھینسا"، موچی اور دیگر ناموں سے فیس بک پیج چلا رہے تھے۔ بیرون ملک تعلقات اور اشیر باد کا اندازہ آپ اس بات سے لگا لیں کہ ابھی ان کو گرفتار ہوئے چند دن بھی نہیں ہوئے کہ رضا ربانی، خورشید شاہ اور فرحت اللہ بابر تو رہے ایک طرف امریکی اور برطانوی وزارت خارجہ نے خصوصی پیغام جاری کیا ہے جس میں اس حوالے سے تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔آئندہ دنوں میں یورپی

(۱) asimmas27@gmail.com

یونین اور شاید اقوام متحدہ کی جانب سے بھی اس بارے میں پاکستانی حکومت پر دباؤ ڈالا جائے گا جب کہ عالمی میڈیا پر ایک بھرپور مہم پہلے ہی شروع کی جا چکی ہے۔ شنید یہی ہے کہ اسلام اور مقدس ہستیوں کے خلاف مذموم مہم چلانے والے ان "بھینسوں" کو تمام ملکی قوانین کو روندتے ہوئے "باعزت رہائی" دلائی جائے گی اور پھر انہیں دیگر ملعون افراد کی طرح امریکہ و یورپ کی شہریت دے کر وہاں لے جایا جائے گا اور بھرپور پروٹوکول کے ذریعے دوبارہ سے اسلام مخالف سرگرمیاں تیز کر دی جائیں گی۔

دراصل یہ پاکستانی حکومت کا بھی امتحان ہے کہ جہاں ایک طرف شدت پسندی اور ملکی سرحدوں پر حملہ آور دہشت گرد گروہوں کے خلاف بھرپور کارروائی کی جارہی ہے وہیں ملک کی نظریاتی اساس، مذہب و معاشرت کے ان دشمنوں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جاتا ہے یا انہیں ماضی کی طرح کلین چٹ فراہم کر دی جاتی ہے۔ ایک گرفتار شخص کے فرسٹ کزن نے باقاعدہ میڈیا پر آ کر انکشاف بھی کیا ہے کہ واقعی وہ اسلام مخالف نیٹ ورک چلا رہا تھا۔ سیکولر اور ملحد گروہوں کا وطیرہ ہی یہ ہے کہ خوب دھڑلے سے اسلام، ذات باری تعالیٰ اور نبی اکرم ﷺ کی شخصیت پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اگر کسی موقع پر ملکی ادارے یا کوئی اور انہیں ٹوکنے کی کوشش کرے تو نام نہاد آزادیٔ اظہار رائے اور سول سوسائٹی کا لبادہ اوڑھ کر مظلوم بن جاتے ہیں۔ بڑے شہروں کے پوش علاقوں میں این جی اوز کی سجی سجائی چند خواتین موم بتیاں جلا کر اظہار یکجہتی کرتی ہیں۔ مغربی ممالک اس بارے میں سفارتی دباؤ ڈالتے ہیں، عالمی میڈیا بھرپور مہم چلاتا ہے اور اس طرح ملک کو سیکولر بنانے والے مذہب بیزار طبقے "اپنے بندوں" کو باآسانی نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ انہیں مغربی ممالک میں انسانی حقوق کے ہیروز کے طور پر رکھا جاتا ہے۔ سلمان رشدی، تسلیمہ نسرین، ملالہ یوسف زئی، شرمین چنائے اور ایسے ہی بے شمار نام ہیں جو مادر وطن پر لعنت ملامت کرنے، اسلام کے بارے میں توہین آمیز مواد پھیلانے، سیکولرازم کے علمبردار ہونے کے کارنامے سرانجام دے کر اب اپنے آقاؤں کے پاس عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ پاکستانی حکومت آج تک کسی ایسے گستاخ اور شر پسند کو قانون کے کٹہرے میں نہیں لا سکی۔ دکھ کی بات یہ بھی ہے کہ ملک میں یہی سیکولر اور ملحدانہ سرگرمیاں بعض عناصر کو موقع فراہم کرتی ہیں کہ وہ لوگ نوجوانوں کو گمراہ کر کے ساتھ ملا لیں۔

اسلامی حلقوں کے خلاف ذرا سی غفلت پر سخت ترین کارروائی ہوتی ہے لیکن توہین اسلام، توہین نبی اکرم ﷺ اور توہین ذات باری تعالیٰ کرنے پر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اگر آج گرفتار بھی ہوئے ہیں تو خدشہ ہے کہ جلد انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ جی ہاں! اسلامی جمہوریہ

پاکستان میں وزیراعظم اور چیف جسٹس کی جعلی تصویر اپ لوڈ کرنے والوں کو تو سزا ملتی ہے لیکن اللہ تعالی ،حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں غلیظ ترین الفاظ استعمال کرنے والوں اور ان کے کارٹون بنانے والوں کو قانون کے کٹہرے میں لانے کی کوئی ہمت نہیں کرتا۔میرا ایمان اور غیرت مجھے اجازت نہیں دیتی کہ وہ الفاظ اور ان کارٹونز کی وہ تفصیلات بیان کروں جو ان گستاخوں کی جانب سے شائع کئے گئے ہیں ۔کمال تو یہ بھی ہے کہ اگر کسی ادارے نے ان پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت کی ہے تو اس کے خلاف دھڑلے سے سرعام احتجاجی مظاہرے کیے جا رہے ہیں ۔ ملک کے وزیر داخلہ سمیت کئی حکومتی اہلکار تھر تھر کانپتے دکھائی دیتے ہیں ۔میڈیا کی بے چینی بڑھتی جا رہی ہے ۔ دس بارہ افراد پر مشتمل احتجاج کو بھی لائیو کوریج مل رہی ہے اور اخبارات کے اولین صفحات پر شائع کیا جا رہا ہے جیسے کوئی بہت بڑا سانحہ ہو گیا ہو۔ہم شاید تاریخ کو بہت جلد بھول جانے والی قوم ہیں ۔ جب گورنر سلمان تاثیر نے جیل میں موجود ایک مجرم کو قانون توڑ کر رہائی دلانے کا اعلان کیا تھا تو تبھی ایک ممتاز قادری نے جنم لیا تھا۔کاش کبھی دوبارہ ایسا نہ ہو۔لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مقدس ہستیوں اور ذات باری تعالی کی توہین کے مرتکب ان افراد کو کڑی سزا دی جائے اور ان کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے ۔ یہ کوئی انصاف نہیں کہ ان کو صرف اس لیے قانون کے کٹہرے میں نہ لایا جا سکے کہ ان کی پشت پر مغربی قوتیں اور سیکولر طبقہ ہے۔کروڑوں مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے والے یہ گستاخ بھی اتنے ہی بڑے مجرم ہیں جتنے خودکش دھماکے کرنے والے درندے ۔۔ یہ ہماری حکومت کا امتحان ہے کہ وہ پہلی مرتبہ کسی توہین مذہب کے مرتکب گستاخ کو سزا سنا سکے گی یا نہیں؟

اگر انہیں "باعزت" چھوڑ دیا گیا تو ہمارے ارباب اختیار کو یاد رکھنا چاہیے کہ ایسے واقعات نوجوان نسل کے دل و دماغ میں فتور پیدا کرتے ہیں اور اس سے وہ بے راہ روی پھیلتی ہے جو نہ صرف ان افراد بلکہ ان کے والدین ،خاندان اور پورے ملک وقوم کے لیے رسوائی کا سبب بنتی ہے۔

ہم علماء کرام اور دینی قوتوں سے بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ خواب خرگوش سے جاگیں، سوشل میڈیا پر متحرک ہوں اور ایسی دل آزاد حرکتوں کے سد باب کا سوچیں ۔انہیں یہ بھی مطالبہ کرنا چاہیے کہ ان لوگوں کو خفیہ اداروں کے ذریعے اٹھوانے کی بجائے ان پر عام عدالتوں میں ۲۹۵ سی کے تحت مقدمہ چلایا جائے اور ان کے جرم کو ثابت کیا جائے تا کہ پاکستان کے ۲۰ کروڑ عوام اور دنیا کے پونے دو ارب مسلمان ان کے چہرے پر پڑی الحاد، اسلام دشمنی اور مغرب پرستی کی چادر سرکنے کا نظارہ کر سکیں۔

فہم دین

عبدالرحمن[۱]

اقامت دین کا صحیح تصور کیا ہے؟

سید مودودیؒ کے تصورِ اقامتِ دین کے بارے میں غلط فہمیاں اور اصل حقائق

''جدید دینی تحریکوں کا اسلامی تعلیم وتربیت سے تغافل'' کے موضوع پر جناب ڈاکٹر محمد امین صاحب کا تبصرہ ان سطور کے لکھنے کا محرک بنا۔ البرہان صحیح معنوں میں حال اور مستقبل کا مجلہ ہے جو جمود اور ہر قسم کی مصلحتوں سے پاک ہے۔ اس کے ہر جملے سے مدیر اور انتظامیہ کا اخلاص جھلکتا ہے اور اس سے ہمیں علمی رہنمائی ملتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ سید مودودیؒ کا تربیتی اور اصلاحی ایجنڈا چار ارکان (مدارج) یا چار مراحل پر مشتمل ہے جو اصلاح فرد، اصلاح خاندان، اصلاح معاشرہ اور اصلاح قیادت ہے۔ اور یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائحہ عمل یعنی [illegible] کے عین مطابق ہے اور ان مراحل کی غرض وغایت اقامت دین ہے۔ جس کے دوام اور انضباط کے لیے امامتِ کبریٰ کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہوگا۔ اس کام کے لیے سید مودودیؒ نے اپنی زندگی میں تمام ممکنہ ذرائع استعمال کیے جن میں تصنیف وتالیف، دعوت وتبلیغ، تعلیم وتربیت، تقریر وتحریر اور بالآخر ۱۹۷۰ء میں سیاسی اور جمہوری راستہ بھی استعمال کیا گیا۔ مولانا مودودیؒ نے اپنی تحریک اور علمی جدوجہد کے ذریعے مغربی تہذیب کا نہ صرف منہ توڑ جواب دیا بلکہ اس پر تابڑ توڑ حملے بھی کیے جس کے نتیجے میں مسلمان ذہنی غلامی سے آزاد ہوئے اور مغربی تہذیب کے بارے میں وحدھا لا مقابل لھا کا نعرہ ناکام ہوا۔ انہوں نے اسلام کی ایک نئی تعبیر پیش کی جس نے نہ صرف عام مسلمانوں بلکہ مخالفین کو بھی متاثر کیا۔ مولانا مودودیؒ نے نہ صرف مغربی تہذیب پر دفاعی اور جارحانہ حملے کیے بلکہ برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کو ایک جذبہ، ولولہ اور وژن بھی دیا۔ پاکستان میں تو مولانا مودودیؒ نے دین کو بازاروں، ایوانوں، عدالتوں اور معاش تک وسیع کر دیا ورنہ لوگ تو دین کو مساجد، مدارس اور خانقاہوں تک محدود سمجھنے

---

[۱] رکن جماعت اسلامی، پی ایچ ڈی سکالر

لگے تھے۔

اس سے بھی بڑھ کر دورِ حاضر میں دین اسلام کا سیاسی ماڈل (اقامت دین) پیش کرنا مولانا مودودیؒ کا بڑا کارنامہ ہے۔ یہ بہت بڑا علمی کام ہے جو مولانا نے کیا ہے۔ سید مودودیؒ نے مذکورہ چار نکاتی ایجنڈے کو اگر [illegible] سے لیا ہے تو اس جدوجہد کی غایت، نصب العین اور ہدف کو قرآنی آیت [illegible] الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ سے لیا ہے۔ لہٰذا اس پر مدیر البرہان کا تبصرہ نامناسب ہے کہ:

’’ہماری دانست میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم، سید مودودیؒ کے تصور اقامت دین کو صحیح سمجھتے تھے اور اسے ہی ان کے فکر و عمل میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اب مولانا مودودیؒ نے اپنے تصورِ اقامت دین کی جو تشریح کی ہے وہ مین سٹریم اسلام کے مطابق نہیں بلکہ اسے اسلام کی سیاسی تعبیر کہا جا سکتا ہے یعنی ان کے نزدیک اسلام ایک تحریک اور نظام ہے جسے سیاسی جدوجہد سے انقلاب امامت کے ذریعے اسلامی حکومت قائم کر کے نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اس تصور سے دینی کام اور فرائض دینی کی جو ترجیحات بنتی ہیں وہ انبیاء کرام کے طریق کار اور خصوصاً نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائحہ عمل یعنی [illegible] سے میل نہیں کھاتیں اور مطابقت نہیں رکھتیں بلکہ سیاسی جدوجہد کے ذریعے انقلابِ امامت اور قیام اسلامی حکومت پہلی ترجیح بن جاتے ہیں.... جو صحیح نہیں ہے۔‘‘

پھر اگلے صفحے پر مزید لکھتے ہیں:

’’اور یہ کہ مولانا مودودیؒ کا اقامت دین کا مخصوص تصور ان کا ایک اجتہادی فیصلہ تھا جو دین کی ایک خاص تعبیر پر مبنی تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ مولانا کا ایک اجتہاد اگر صحیح ثابت نہ ہو سکا تو اس سے نہ ان کی عظمت اور علمی تبحر پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ اس پر انہیں مطعون کیا جانا چاہیے بلکہ اجتہاد پر نظر ثانی کر لینی چاہیے [بلکہ اس کے بہت سے شواہد موجود ہیں کہ مولانا مودودیؒ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جماعت کی ناکامی کے بعد ’’قیام اسلامی ریاست بذریعہ اصلاح فرد و معاشرہ‘‘ کی طرف لوٹ جانا چاہتے تھے لیکن جماعت کی قیادت نے ان کا ساتھ نہ دیا اور خود وہ بوڑھے اور بیمار تھے۔ اس لیے نئے اصولوں پر کوئی تحریک نہ چلا سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے جماعت کے لیے

مسئلہ کھڑا کرنے کی بجائے خاموشی اختیار کرلی۔''

میری رائے میں یہ بھی سید مودودیؒ کے ساتھ انصاف نہیں ہے کیونکہ اقامت دین کا مخصوص تصور نکال دیا جائے تو پیچھے سیکولرازم رہ جائے گا جس کے خلاف تو مدیر البرہان نے بھی علم بغاوت بلند کیا ہوا ہے۔ ان کا یہ جملہ ''لیکن جماعت کی قیادت نے ان کا ساتھ نہ دیا'' یہ میں نے بھی سنا ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت میرے علم میں نہیں۔ اگر کسی کے پاس ہو تو اسے اس کو اہل علم کے سامنے لانا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ سید مودودیؒ اس چار نکاتی ایجنڈے کے ذریعے اقامت دین کے خواہشمند تھے اور اس کے لیے انہوں نے ہر دروازے پر دستک دی ہے۔ ان میں سے ایک دروازہ جمہوریت کا بھی تھا۔ اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں کہ مولانا صرف جمہوریت اور اقتدار کے ذریعے دین کو غالب کرنا چاہتے تھے لیکن بدقسمتی سے چونکہ اس راستے سے جماعت اسلامی میں اتنی خرابیاں اور کمزوریاں آگئی ہیں کہ کئی اہل دانش نے سید مودودیؒ کے تصورِ اقامت دین کے خلاف لکھنا شروع کر دیا ہے۔

مثلاً مولانا مودودیؒ نے مغربی تہذیب کے مقابل میں اسلامی تہذیب کے پانچ ارکان بیان کیے ہیں کہ الحاد کے مقابل میں توحید، مادیت کے مقابل میں اخلاص، جمہوریت کے مقابل میں شورایت، قومیت کے مقابل میں امت اور سودی معیشت کے مقابل میں اسلامی معیشت ہے۔ تاہم یہ بات ٹھیک ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اقامت دین کے ذرائع میں سے انتخابی ذریعہ ترجیح بنتی گئی اور باقی ذرائع یا تو ختم ہو گئے یا ضمنی بن گئے۔ یہاں تک کہ اب عام لوگوں کو دیگر ذرائع نظر ہی نہیں آ رہے اور جن کو نظر آتے ہیں تو وہ انہیں بھی انتخابی سیاست کے ساتھ لنک کر رہے ہیں۔ دراصل یہ فکر مودودیؒ سے ناانصافی ہے۔ مثلاً تعلیم بھی ایک ذریعہ تھا اصلاح اور اقامت دین کا لیکن تعلیم اب تجارت بن گئی ہے۔ جماعت کی فکر سے متعلق لوگوں کے ہزاروں ادارے ہیں لیکن ان اداروں میں کسی چیز کی کمی ہے تو وہ فکر مودودیؒ ہے۔ جبکہ مغربی تہذیب کے جراثیم ان اداروں کے نظام کے گوشت پوست کا حصہ بن گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر مدیر البرہان مولانا مودودیؒ کے تصور اقامت دین کے طریقہ کار سے اختلاف کرتے یا اسے غلط کہتے تو اس پر کسی حد تک بات ہو سکتی تھی اور ہونی بھی چاہیے لیکن تصور اقامت دین کو غلط

قرار دینا مناسب نہیں البتہ جمہوری راستہ اختیار کرنے پر بات ہو سکتی ہے۔ میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ جمہوری راستے سے جماعت اسلامی کے اندر جو سب سے بڑی خرابی آئی ہے وہ مغربی تہذیب کے رکن''مادیت'' کا اسلامی تہذیب کے رکن''اخلاص'' پر حملہ ہے، جس نے اخلاص کا خون کیا ہے اور اس کو معدوم کر کے خود اس کی جگہ لینے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ بہت خطرناک وائرس ہے جو بہت تیزی کے ساتھ جماعت کے اندر گھستا چلا جا رہا ہے اور اس کے سدّ باب کے لیے کوششوں کی ضرورت ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس وقت جمہوری میدان میں جدوجہد کرنے کی بجائے دورِ حاضر کے بعض اہم چیلنجز کے مقابلے کے لیے دیگر ذرائع اختیار کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ میں مدیر البرہان کی اس کاوش اور فکر مندی کی تائید کرتا ہوں کہ اس وقت ہمیں دین کی اقامت کے متبادل ذرائع تلاش کرنے چاہئیں اور صرف جمہوریت پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ جمہوریت کو خود پر مسلط کرنے والے تو اب خود بھی جمہوریت سے نالاں ہیں اور امریکہ کے حالیہ انتخابات اس کی واضح دلیل ہیں۔

الغرض جماعت اسلامی اس چار نکاتی ایجنڈے پر بھی کام کر رہی ہے البتہ اصلاح قیادت اور انقلاب امامت کا مسئلہ اس وقت مرکزیت اختیار کر گیا ہے۔ یعنی اوپر سے نیچے کی طرف اصلاح کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس کے لیے بھی ایک مخصوص مروجہ اور روایتی طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ میری رائے بھی یہ ہے کہ اصلاح کا عمل نیچے سے شروع کیا جائے اور اس کے لیے روایتی ذرائع کے علاوہ دیگر ذرائع بھی اختیار کیے جائیں۔ جماعت اسلامی کے بارے میں آج کل یہ بات بھی متعارف کرائی جاتی ہے کہ جماعت اسلامی ایک جمہوری جماعت ہے۔ میرے خیال میں مناسب ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ جماعت اسلامی ایک شورائی جماعت ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

نوٹ: درج بالا تحریر میری ذاتی رائے ہے، اسے جماعت اسلامی کی رائے نہ سمجھا جائے۔

استفسارات/اسلام اور مغرب　　مدیر

مغربی فکر و تہذیب کے ردّ و قبول کے حوالے سے

کیا مدیر البرہان کا موقف شدت پسندی پر مبنی ہے؟

احمد جاوید صاحب اور پروفیسر شاہد رشید صاحب کی آراء کے تناظر میں

سوال: پنجاب یونیورسٹی میں آپ نے طلبہ کی کردار سازی پر جو سیمینار کرایا تھا مجھے بھی اس میں حاضری کا موقع ملا۔ آپ نے مغربی فکر و تہذیب کو مکمل رد کرنے کے بارے میں پرزور تقریر کی جب کہ اسی موضوع پر پروفیسر شاہد رشید صاحب کا رویہ کچھ دھیما تھا۔ انہوں نے کہا کہ مغرب کے گہرے مطالعے اور تفہیم کی ضرورت ہے۔ اور یہ دیکھنا ہوگا کہ اس میں کیا چیز ہے جس سے ہم استفادہ کر سکتے ہیں اور کس کو رد کرنا چاہیے۔ مغرب پر سطحی تنقید کا، بہرحال، کوئی فائدہ نہیں (شاید آپ کی طرف اشارہ تھا)۔ اسی سے ملتی جلتی بات جناب احمد جاوید صاحب نے بھی کہی۔ اس سے میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا مغربی فکر و تہذیب کے حوالے سے آپ کا موقف شدت پسندی پر مبنی ہے اور دوسرے لوگوں سے مختلف ہے؟

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی فکر و تہذیب کے رد کے حوالے سے ہمارا موقف سخت ہے۔ اس کے لیے ہمارے ذہن میں جو جواز اور حکمت ہے پہلے وہ سن لیجیے پھر دوسرے اہل علم کے موقف کی بات کریں گے۔

۱۔ مغربی فکر و تہذیب کے حوالے سے ہمارا موقف کئی قرآنی، شرعی اور عقلی دلائل پر مبنی ہے مثلاً قرآن و سنت میں دو امور کے بارے میں بڑا سخت اور شدید موقف اختیار کیا گیا ہے۔ ایک سود کے بارے میں اور دوسرا غیبت کے بارے میں۔ سود کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو سود لینا دینا نہیں چھوڑتا گویا وہ اللہ و رسول کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا سود کھانا ایسے ہی ہے جیسے اپنی ماں سے زنا کرنا۔ غیبت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ غیبت ایسے ہی ہے جیسے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم نے جس کی غیبت کی گویا اسے قتل کر دیا اور یہ کہ اللہ کبھی غیبت کرنے والے کو معاف نہیں کرے گا جب تک متعلقہ شخص اسے معاف نہ کرے اور عدم معافی کی صورت حشر میں اس کی

نیکیاں متعلقہ مظلوم شخص کو دے دی جائیں گی۔سود اور غیبت کے بارے میں قرآن وسنت کے اس شدید موقف کی وجہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں میں ان دو جرائم کے خلاف نفرت اور کراہت پیدا کرنا چاہتے ہیں جب کہ لوگ عام طور پر ان کو ہلکا لیتے ہیں۔سخت احکام اور ان جرائم کے خلاف نفرت اور کراہت کی ایک عمومی فضا قائم کرنا اللہ ورسول نے اس لیے ضروری اور مفید سمجھا تاکہ لوگ ان دو جرائم کے قبیح ہونے کو شدت سے محسوس کریں اور اس سے باز آجائیں۔

۲۔ قرآن وسنت کا یہ بھی اسلوب ہے کہ جب وہ کسی جرم کی قباحت اور سنگینی کی بنیاد پر اسے حرام قرار دیتے ہیں تو پھر وہ ان سارے دروازوں اور کھڑکیوں کو بند کرتے چلے جاتے ہیں جو اس طرف کھلتے ہیں تاکہ اس جرم کا ارتکاب آسان نہ رہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے زنا کو اس کے عظیم فساد ومضرات کی وجہ سے حرام قرار دیا تو شراب نوشی سے بھی روکا،رقص وسرود سے بھی منع کیا،فحش باتیں کرنے اور سننے سے روکا،عورتوں اور مردوں میں اختلاط سے منع کیا،مرد وعورت کو تنہا ملنے سے روکا،عورت کو پردے کا اور زینت اور چہرہ چھپانے کا حکم دیا،یہاں تک کہ تمام عورتوں اور مردوں کو غض بصر کا حکم دیا کہ نظر بھر کر ایک دوسرے کو دیکھو بھی نہیں۔یہ سارے احکام اس لیے دیے تاکہ زنا کی طرف جانے والے سارے راستے بند ہو جائیں۔

ہمارے فقہاء نے اس شرعی اصول سے استنباط کرتے ہوئے''سدّ الذریعۃ' کا قاعدہ وضع کیا کہ جو امور شریعت نے نصوص میں منع نہیں کیے،اگر وہ بھی جرم کی طرف جانے کا سبب بنتے ہوں تو ان پر بھی پابندی لگائی جائے گی۔اسی طرح محقق صوفیاء بطور علاج بعض اخلاقی مریضوں کے لیے قلت طعام وکلام ومنام تجویز کرتے ہیں۔مثلاً بولنا انسانی فطرت وضرورت ہے لیکن اگر کوئی شخص ہر وقت بولتا ہی رہے اور جھوٹ سچ،مفید مضر،اچھی بات اور فضول یاوہ گوئی میں فرق نہ کرے تو ایسے مریض نفس کو اگر مزکی ومرشد بطور علاج کم بولنے کا حکم دے یا چند روز خاموش رہنے کا یا لکھ کر بات کرنے کا حکم دے تو مذکورہ بالا شرعی اصول اور سد الذریعہ کی رو سے یہ جائز ہے۔

۳۔ جس کلمہ کو پڑھ کر ہم مسلمان ہوتے ہیں یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ افضل ترین ذکر اور کلمہ ہے،اس میں جھوٹے خداؤں کی نفی پہلے ہے اور ایک اللہ کا اثبات بعد میں۔یہ ترتیب فطری اور منطقی ہے کیونکہ جب تک

سارے جھوٹے خداؤں کی پہلے نفی نہ کی جائے، ایک خدا کا اثبات بے معنی ہے۔

ان شرعی اصولوں کا اطلاق اب زیر بحث مسئلے پر کر کے دیکھ لیجیے۔

۱۔ مغربی فکر وتہذیب بلا شک وشبہ ماسوا اسلام ہے، یہ طاغوت ہے۔ یہ ابلیسیت اور شرک بلکہ انکار خدا اور وحی پر مبنی ہے۔ اس کی اسلام اور مسلم دشمنی بھی مسلّمہ امر ہے اور ہم سب کے مشاہدے میں ہے۔ قرآن وسنت بھی یہود ونصاریٰ کی اسلام اور مسلم دشمنی کا اعلان کرتے ہیں اور ان کے شر سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ پچھلی دو تین صدیوں میں مغربی استعمار نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا وہ کس سے مخفی ہے؟ اس نے سازشوں سے مسلمانوں کو باہم لڑایا، ان کو کمزور کیا، ان کو جنگوں میں دھکیلا، ان کے علاقوں پر قبضہ کیا، انہیں تاراج کیا، لوٹا، غلام بنایا، پھر انہیں غلام بنائے رکھنے کے لیے ان کے اجتماعی ڈھانچے کو توڑا اور ان کا تعلیمی قانونی، سیاسی معاشی نظام اپنی فکر وتہذیب کے مطابق از سر نو تشکیل دیا۔ مجبوراً مسلم ممالک کو آزادی دینا پڑی تو اقتدار اپنے پالک، اپنے تربیت یافتہ اور فکری غلامی کو آزادی سمجھنے والے مسلم طبقات کے سپرد کیا۔ پھر ان ایجنٹ حکمرانوں کے ذریعے پر امن طریقے سے تعلیم، جمہوریت، میڈیا، قرضوں کی معیشت، سیاسی عدم استحکام، ثقافت، شعر وادب کے ذریعے اور ترقی، آزادی، مساوات، تحدید آبادی اور بہبودیٔ نسواں وومن امپاورمنٹ جیسے خوبصورت الفاظ استعمال کر کے اپنے تہذیبی اور فکری ایجنڈے کو مسلم معاشروں پر مسلط کیا... اور پھر اس سب کے باوجود جب کچھ مسلم ممالک مضبوط ہو گئے اور بعض نے اسلام کی طرف مراجعت کی کوشش کی تو مغرب نے متحد ہو کر اور اپنی مہیب و جدید جنگی مشینری کو حرکت میں لا کر مسلم ممالک کو تباہ وبرباد کرنا شروع کیا۔ عراق، افغانستان اور لیبیا کو تاراج کیا جا چکا، شام اور یمن تباہ کیے جا رہے ہیں اور پاکستان، نائیجیریا وغیرہ ہدف پر اور دباؤ میں ہیں۔ اس استعمار کی، اس دشمن جان وایمان کی اگر ہم علمی وفکری سطح پر مزاحمت کریں تو ہمیں احباب انتہا پسندی اور شدت پسندی کے طعنے دیں۔ چہ عجب؟ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

۲۔ جب ہم پر یونانی علوم کا فکری حملہ ہوا تو ہم سیاسی طور پر مستحکم، فکری طور پر توانا اور تہذیبی لحاظ سے غالب تھے لہٰذا ہم اس فکری حملے کو سہار گئے۔ تاتاریوں نے ہمیں عسکری لحاظ سے شکست دی لیکن ہم فکری طور پر بتدریج ان پر غالب آ گئے۔ اس کے برعکس آج کی مغربی تہذیب ہم پر ہر طرف سے حملہ آور ہے عسکری لحاظ سے، تعلیمی لحاظ سے، فکری لحاظ سے، قانونی

لحاظ سے،تہذیبی وثقافتی لحاظ سے اور وہ غالب ہے اور ہم مغلوب ہو چکے ہیں۔اس نے ہمیں فکری غلام بنائے رکھنے کے لیے ہم میں جعلی نبی کھڑا کیا، اس نے جعلی قرآن چھاپ کر تقسیم کیا، وہ نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جن سے مسلمان محبت کرتے ہیں، مغرب نے ان کے کارٹون چھاپے،اس نے ہم میں پرویز اور غامدی جیسے سکالر کھڑے کیے تا کہ دین کے دوسرے ماخذ سنت کو مشکوک ٹھہرایا جائے۔دو تین صدیوں کی ذلت اور غلامی سہنے کے بعد اب جب ہم اپنے منابع قوت (اسلامی تعلیمات) کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں، مغرب کی فکری اور عملی غلامی سے نکلنا چاہتے ہیں اور مغربی فکر وتہذیب کو رد کرنے کی اور اسلام کی طرف مراجعت کی بات کرتے ہیں تو ہمارے احباب کہتے ہیں کہ تمہارا رویہ شدت پسندی پر مبنی ہے؟

۳۔ ہم جانتے ہیں کہ کوئی تہذیب فضا میں زندہ نہیں رہتی، ہوا بند خانوں (Air Tight Compartments) میں نہیں پنپ سکتی اور دوسری تہذیبوں کے علوم ومعارف اور انسانی تجربات سے محدود استفادہ ناگزیر ہوتا ہے لیکن ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ ہمارے لوگوں میں ابھی خوئے غلامی باقی ہے۔ہم مسلمان اہل مغرب کے ستائے اور ڈسے ہوئے ہیں لیکن ہمارے حکمرانوں، ادیبوں، بیوروکریسی، عدلیہ اور جدید تعلیم یافتہ افراد کی اکثریت،شعوری یا غیر شعوری طور پر، اب بھی مغربی تہذیب کی طرف لپکتی ہے، اس میں اپنے درد کا درماں ڈھونڈتی ہے اور اس کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہے لہٰذا ہم مجبور ہیں کہ سد الذریعہ کے اصول پر مغرب سے جائز استفادے کی بھی وقتی طور پر مزاحمت کریں جس طرح صوفیاءقلت طعام کی تلقین کرتے ہیں حالانکہ غذا کھانا انسان کی فطری ضرورت ہے اور عمدہ کھانا اور اس کا وافر مہیا رہنا اس کی طبیعت کا تقاضا ہے۔اس کے باوجود مزکی مرید کی اصلاح اور اس کے فائدے کے لیے قلت طعام کا حکم دیتا ہے اور فقیہ جائز اور مباح کاموں سے سد الذریعہ کے اصول کے تحت منع ہونے کا فتوی دیتا ہے۔ اسی طرح ہم بھی اپنی قوم کی مغرب کی غلامی کی خو کے پیش نظر اصرار کرتے ہیں کہ پہلے اسے "لا" کہو، پہلے اس کے اصولی طور پر مکمل رد کا اقرار کرو اور یہ کہو کہ ہماری قوت ونصرت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے،صرف اس کی اطاعت میں ہے، مغرب کی تقلید میں نہیں ہے۔ پہلے اس رویے پر پختہ ہو جاؤ۔ پھر جب تمہارے اس رویے میں پختگی آجائے گی تو پھر ہم کہیں گے کہ ہاں! مغرب سے محتاط استفادہ جائز ہے۔جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں سے پہلے کہا کہ قبرستان نہ جایا کرو لیکن جب توحید دلوں میں مستحکم ہوگئی تو پھر جانے کی اجازت دے دی۔ پہلے جوتوں سمیت

نماز پڑھنے کی اجازت دی۔ پھر جب نماز اور طہارت کی عادت ہوگئی تو کہا جوتے اتار کر نماز پڑھا کرو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ مولفۃ القلوب کی مد میں بعض لوگوں کو رقمیں دیتے رہے۔ جب اسلام کو شوکت حاصل ہوگئی تو حضرت عمرؓ نے کہا دوڑ جاؤ۔ اب ہم تمہیں کچھ نہیں دیں گے۔ غرض شریعت کے بہت سارے قاعدے اسی اصول پر مبنی ہیں۔

۴۔ اپنے موقف کی وضاحت کے بعد اب آیئے جناب احمد جاوید صاحب اور شاہد رشید صاحب کے طرز عمل کی طرف۔ یاد رہے کہ شاہد رشید صاحب ہمارے دوست ہیں اور جناب احمد جاوید صاحب اصلاح وتزکیہ میں ہمارے مربی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ وہ دونوں بھی مغربی فکر وتہذیب کے مضرات کو سمجھتے ہیں اور اس کی مذمت کرتے ہیں لہٰذا ہمارے اور ان کے موقف میں انیس بیس کا فرق ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مغربی فکر وتہذیب کا گہرا مطالعہ کیا جائے، اس کی فلسفیانہ اور فکری بنیادوں کو خوب سمجھا جائے اور ٹھوس علمی بنیادوں پر اس کو رد کیا جائے۔ ہمیں ان کی اس بات سے کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ علمی گہرائی، اسلوب اور اظہار کے طرق واسالیب کا فرق ضرور ہے۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ علمی اور ٹھوس بات وہ ہوتی ہے جو دقیق ہو، جس میں حوالوں کی کثرت ہو۔ پھر مخاطب کا بھی فرق ہوتا ہے۔ اگر آپ اہل علم سے مخاطب ہوں تو اسلوب میں گہرائی اور پختگی ہونی چاہیے۔ عام آدمی سے مخاطب ہوں تو بات سادہ اور عام فہم انداز میں کرنی چاہیے۔

ہمارا ذاتی موقف یہ ہے کہ ہم مقصد ابلاغ کو اہمیت دیتے ہیں۔ یعنی ہمارے نزدیک تحریر یا تقریر کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخاطب بات سمجھ جائے۔ اس لیے ہم بات سادہ اور عام فہم انداز میں کرتے ہیں۔ اس وجہ سے بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہماری باتوں میں گہرائی نہیں ہوتی۔ احمد جاوید صاحب کے بارے میں عرض ہے کہ وہ اپنی تربیت اور مزاج کے لحاظ سے فلسفی ہیں لہٰذا وہ اپنی بات سادہ اور عام فہم انداز میں کہہ ہی نہیں سکتے۔ ان کی باتیں لازماً دقیق اور گہری ہوں گی خواہ وہ قاری یا سامع کی سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں۔ کچھ یہی حال پروفیسر شاہد رشید صاحب کا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ مخاطبین کی علمی سطح گر گئی ہے۔ لوگ نہ تو فارسی جانتے ہیں اور نہ عربی بلکہ انگریزی میں بھی اکثر لوگ کمزور ہوتے ہیں اور یہی حال اردو کا ہے۔ روز مرہ کی زبان الگ ہوتی ہے اور فصیح اور علمی زبان الگ ہوتی ہے۔ تو جب سامعین اور قارئین کی علمی سطح اخبار بینی تک محدود ہو تو مقرر کا اس میں کیا قصور ہے؟

علم میں تفاوت بھی ہے اور وہ بھی فطری ہے۔ احمد جاوید صاحب اور شاہد رشید صاحب کا مغرب کا مطالعہ یقیناً گہرا ہے جب کہ راقم اصلاً اسلامی وعربی علوم کا آدمی ہے جب کہ شاہد صاحب سوشیالوجی اور احمد جاوید صاحب ادب واقبالیات کے متخصص ہیں اگرچہ دونوں دینی علوم میں ماشاءاللہ خوب مہارت رکھتے ہیں۔ اسی لیے راقم ان دونوں بزرگوں سے ماضی میں بھی کہتا رہا ہے (بزرگ علم وعمل کے لحاظ سے ورنہ عمر میری ان دونوں سے زیادہ ہے بلکہ شاہد رشید صاحب تو ابھی 'نوجوان' ہیں) اور اب بھی کہتا ہے کہ وہ اعلی علمی انداز میں اسلام کی حقانیت اور مغربی فکر وتہذیب کے رد کے بارے میں لکھیں تاکہ یہ خلا پُر ہو لیکن افسوس کہ دونوں ابھی تک اس کے لیے وقت نہیں نکال پائے۔ اور جب میدان خالی ہے تو ہم جیسے کم علم اپنی محدود صلاحیت اور سادہ اسلوب کے مطابق لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس پر کسی کو شکوہ یا گلہ نہیں ہونا چاہیے۔

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

زرِاعانت سالانہ 400 روپے   تاحیات 5000 روپے

نام..............................

پتہ..............................

..............................فون..............................

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-97 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوایئے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنٰی ہیں

نوائے حق ''حق گو''

پہنچی وہیں پہ خاک....

اور ایک جرأت مند وکیل کی تلاش

ہم نے پروفیسر افلاطون کو فون کیا کہ اگلی مجلس مذاکرہ کب ہوگی؟ انہوں نے کہا: آپ کے ذہن میں کوئی خاص موضوع ہے؟ ہم نے کہا: پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم نے البرہان کے پچھلے شمارے میں جو لکھا تھا وہ صحیح ثابت ہوگیا ہے۔ پروفیسر افلاطون کہنے لگے: میرے ذہن میں نہیں آپ نے کیا لکھا تھا؟ ہم نے کہا: یہی لکھا تھا کہ جنرل راحیل امریکہ کے آدمی تھے اور وزیرستان آپریشن انہوں نے امریکیوں کے کہنے پر ہی کیا تھا۔ پروفیسر افلاطون کہنے لگے تو آپ کی بات سچ کیسے ثابت ہوگئی؟ ہم نے کہا سعودیوں نے جو ۳۹ مسلم ممالک کی دہشت گردی کے خلاف مشترکہ فوج بنائی ہے، وہ ایک امریکی پراجیکٹ ہے اور اس کی سربراہی کے لیے ایک ایسا ''نیک نام'' اور ''تجربہ کار'' جرنیل درکار تھا جو امریکی مفادات کے لیے کام کر سکے تو وہ انہیں راحیل شریف کی صورت میں مل گیا ہے۔ گویا پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ پروفیسر افلاطون کہنے لگے اس میں امریکی مفاد کیا ہے؟ ہم نے کہا: بھائی آپ تو بہت ہی سادہ ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ جس طرح امریکہ نے پاکستانی افواج کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا۔ اب وہ اپنے غلام سعودی حکمرانوں کے ذریعے ۳۹ مسلم ممالک کی فوج کو اپنی مرضی کے کمانڈر کے ذریعے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرے گا۔ پروفیسر افلاطون پوچھنے لگے: آپ کے خیال میں اگلا امریکی منصوبہ کیا ہے؟ ہم نے کہا: آپ ساری باتیں فون پر ہی پوچھ لیں گے یا اجلاس بھی بلائیں گے؟ پروفیسر افلاطون کہنے لگے بہت سے لوگ آپ سے اتفاق نہیں کریں گے لیکن چلیے اگر آپ کی رائے یہی ہے تو آپ نے اپنی بات کہہ لی، اب اگلی مجلس مذاکرہ کس لیے بلائیں؟

ہم نے کہا: اگلا موضوع یہ ہے کہ ایک جرأت مند مسلمان پاکستانی وکیل کی تلاش کے بارے میں سوچا جائے۔ پروفیسر افلاطون کہنے لگے: یہ وکیل کیا کرے گا؟ ہم نے کہا: ہماری تجویز یہ ہے کہ یہ وکیل سپریم کورٹ میں مقدمہ لڑے۔ پروفیسر افلاطون کہنے لگے: کس کا مقدمہ؟ ہم نے کہا اسلام، پاکستان بلکہ پوری پاکستانی قوم کا مقدمہ۔ انہوں نے کہا: اس مقدمے کا موضوع

اور مقصد کیا ہوگا؟ ہم نے کہا یہ مقدمہ اس لیے لڑا جائے گا کہ جن افراد نے پاکستان کو ۱۱۸ بلین ڈالر کا ٹیکہ لگایا اور ۵۵ ہزار بے گناہ پاکستانیوں کو قتل کرایا، ان کو سزا دینے کا مطالبہ کیا جائے۔ پروفیسر افلاطون کہنے لگے: اور یہ مقدمہ کس کے خلاف ہوگا؟ ہم نے کہا جنرل پرویز مشرف اس کے مرکزی ملزم ہوں گے اور دوسرے ملزموں میں زرداری، نواز شریف، جنرل کیانی اور جنرل راحیل شریف ہوں گے۔ پروفیسر افلاطون نے کہا: اور آپ کا کیا خیال ہے ہماری سپریم کورٹ یہ مقدمہ سنے گی؟ ہم نے کہا: ہماری عدلیہ اگرچہ سیکولر ہے اور قرآن وسنت کی پابند نہیں لیکن آئین پاکستان کی پابند تو بہر حال ہے۔ اور وہ اتنی زندہ ضمیر بھی ہے کہ اگر مالکان ایک دس سالہ ملازمہ ''طیبہ'' کو ماریں پیٹیں تو وہ اس پر سوموٹو ایکشن لے لیتی ہے تو ۵۵ ہزار بے گناہ آدمیوں کے قتل اور کھربوں روپے کے نقصان کا مقدمہ وہ کیوں نہیں سنے گی؟ یہ مقدمہ اسے ضرور سننا چاہیے۔

ہم نے مدیر البرہان کو پروفیسر افلاطون سے ہونے والی گفتگو سنائی تو وہ کہنے لگے: آپ کو ''قربانی'' کے لیے وکیل تو پتا نہیں ملے یا نہ ملے لیکن آپ 'البرہان' ضرور بند کرائیں گے اور مجھ بوڑھے بیمار آدمی کو ضرور 'اندر' کرائیں گے۔ یا اللّٰہُ یا سلامُ.

لا و اِلّا ٭

فضائے نُور میں کرتا نہ شاخ و برگ و بَر پیدا
سفر خاکی شبستاں سے نہ کر سکتا اگر دانہ

نہادِ زندگی میں ابتدا 'لا' انتہا 'اِلّا'
پیامِ موت ہے جب 'لا' ہوا 'اِلّا' سے بیگانہ

وہ ملت رُوح جس کی 'لا' سے آگے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو، ہوا لبریز اُس ملت کا پیمانہ

اقبالؒ

٭ یعنی صرف لا اِلٰہ کہنا کافی نہیں جب تک ماسوا اللّٰہ کا انکار نہ کیا جائے۔

اسلامی تحریکیں

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

اسلامی انقلابی جدوجہد ٹرمپ کی کامیابی سے کیا سیکھ سکتی ہے؟

[ڈاکٹر صاحب ایک بزرگ دانشور اور مفکر ہیں اور ہمارے معاشرے میں مغرب کی الحادی تہذیب کے خلاف سخت موقف کے حوالے سے جانے جاتے ہیں اورانہوں نے اس کے لیے عمدہ ٹیم تیار کی ہے۔ان کی خدمات کی وجہ سے ہم ان سے اختلاف کو نمایاں کرنا نہیں چاہتے تھے جبکہ ان کے اس مضمون کے مندرجات سے ہمیں اتفاق نہیں تھا لہٰذا ہم اسے شائع کرنے میں متردد تھے۔ان کے تلمیذ رشید امین اشعر صاحب نے کہا کہ آپ ڈاکٹر صاحب کا مضمون البرہان میں دے دیں اور بے شک اس کے بارے میں اختلافی نوٹ بھی دے دیں لہٰذا قارئین ڈاکٹر انصاری صاحب کے مضمون کے بعد اس پر ہمارا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔مدیر]

ٹرمپ کی غیر متوقع کامیابی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اسلامی جماعتیں انقلابی جمہوری عمل کی نوعیت اور سرمایہ دارانہ نظام میں اس کی حیثیت اور فعلیت پر از سر نو غور کریں۔اس مضمون میں چند سوالات اٹھا کر میں ان امور کی نشاندہی کروں گا جن پر ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ابتداءً انقلاب، سرمایہ داری اور جمہوریت کا جو مفہوم میں سمجھا ہوں وہ بیان کروں گا، اس کے بعد ٹرمپ کی کامیابی کے اسباب پر غور کر کے اس بات کا جواز پیش کرنے کی کوشش کروں گا کہ ٹرمپ کی کامیابی کو کیوں ایک انقلاب کا پیش خیمہ سمجھتا ہوں۔اس بحث کے تناظر میں اسلامی انقلابی جماعتوں کی جمہوری جدوجہد کے ضمن میں چند گزارشات پیش کر کے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا کہ جمہوری عمل سے ہمیں کیا توقعات رکھنی چاہئیں؟

سرمایہ داری، جمہوریت اور انقلاب

سرمایہ داری وہ طرز اور نظام زندگی ہے جو آزادی، مساوات اور ترقی کے حصول کو انسانیت کا نوعی حق (Human Right) سمجھتا ہے اور انفرادیت، معاشرت اور ریاست کی ترتیب اور تعمیر کو ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کا ذریعہ گردانتا ہے۔جمہوریت وہ نظمِ ریاست ہے جس میں اجتماعی

فیصلے فرد کی آزادی، مساوات اور ترقی کے حصول کی خواہش کے اظہار کے طور پر اپنا جواز پیش کرتے ہیں۔اسی لیے ہر سرمایہ دارانہ ریاست، خواہ لبرل ہو یا قوم پرست، اشتراکی ہو یا سوشل ڈیموکریٹ ایک ریپبلک حکومت ہوتی ہے۔لبرل اور عوامی جمہوریتیں دونوں عوام کی حاکمیت کی دعوے دار ہیں اور دونوں ہی ریاستی مقتدرہ (State Elite) پر اپنے تفوق (Hegemony) کا جواز عوام کی نمائندگی کی بنیاد پر پیش کرتی ہیں۔سرمایہ دارنہ طرز اور نظام زندگی میں ریاستی تحکم کا یہ جواز ناگزیر ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام اور طرز زندگی اصولاً دہریت کا غماز ہے۔اس طرز اور نظام زندگی میں انسانیت خدا کی موت کا اعلان اور اپنی خودمختاری اور خودتخلیقیت کا اعلان کرتی ہے۔سرمایہ دارانہ طرز اور نظامِ زندگی کا کلمہ خبیثہ لا الہ الا الانسان ہوتا ہے عوام کی حکومت (Republic) لبرل بھی ہوسکتی ہے۔اشترکی بھی، قوم پرست اور سوشل ڈیموکریٹ بھی۔تاریخی طور پر انقلاب سے مراد وہ عمل ہے جس کے ذریعہ رائج شدہ طرز اور نظم ریاست کو تسخیر کرکے ایک دوسرے طرز اور نظم ریاست کو قائم کیا جاتا ہے۔سرمایہ دارانہ تاریخ کے تناظر میں انقلابات بیرونی بھی ہوسکتے ہیں اور اندرونی بھی۔۱۷ویں اور ۱۸ویں صدی تک یورپ، امریکہ اور ایشیاء میں مذہبی ریاستوں (جو Republic نہ تھیں) کو مسخر کرکے سرمایہ دارانہ طرز اور نظم ریاستیں قائم کیا گیا، یہ بیرونی انقلاب تھا۔۱۹ویں صدی کے بعد سے ایک سرمایہ دارانہ ریاستی نظام کو مسخر کرکے متبادل سرمایہ دارانہ ریپبلک کی تعمیر کی جاتی رہی ہے، کبھی لبرل رپبلکس کی جگہ اشتراکی رپبلکس نے لے لی، کبھی اشتراکی رپبلکس کو مسخر کرکے لبرل قوم پرست ریاستیں بنائی گئیں، یہ سرمایہ دارانہ اندرونی انقلابات ہیں۔

ٹرمپ کا متوقع انقلاب

۱۹۸۰ کے بعد سرمایہ دارانہ نظام معاشی طور پر پر گلوبل ہوگیا۔سود، سٹہ اور اشیاء کی مارکیٹ (Financial,Stock and Commodity Market) گلوبل ہوگئے اور بہت بڑی حد تک ترسیل زر اور اشیاء پر ملکی پابندیاں اٹھائی گئیں۔کسی نہ کسی حد تک سرمایہ دارانہ معاشرتی اور ریاستی مقتدرہ بھی گلوبل (Multinational Cosmopolitan) ہوگئیں لیکن سرمایہ دارانہ ریاستی نظم قومی ہی رہا اور امریکی قومی ریاست نے گلوبل سرمایہ کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کی۔ عالمی دفاعی اخراجات کا تقریباً ۴۵ فی صد امریکہ ہی صرف کرتا ہے اور اس کی افواج ۱۸۳ ممالک

میں اڈے بنا کر قتل عام میں مصروف ہیں۔

گلوبل اور ملکی ریاستی تنظیم نے معاشرتی عدم توازن کو جنم دیا۔گلوبل معاشی عمل سے مستفید سرمایہ دارانہ معاشرتی اور ریاستی مقتدرہ ہی ہوئی۔ترقی یافتہ ممالک کے عوام بالخصوص امریکی اپنے آپ کو گلوبلائزیشن کا شکار (Victim) گردانے لگے کیوں کہ امریکہ میں معاشی عدم مساوات (inequality) ہوشربا انداز سے مسلسل بڑھ رہی ہے اور ایک عام امریکی گلوبلائزیشن کو اپنے لئے مضر گرداننے لگا ہے۔ٹرمپ کو کامیاب بنا کر ایک عام امریکی جو اپنے آپ کو محروم سمجھ رہا ہے گلوبل اشرافیہ، اس کے غیر ملکی حلیفوں اور اس اشرافیہ کے لائے ہوئے غیر ملکی مزدوروں اور محنت کاروں سے بدلہ لے رہا ہے۔ایک عام امریکی اس بات سے نالاں ہے کہ جب امریکی ریاست عسکری اور معاشی وسائل عالمی سرمایہ کی بڑھوتری کے لئے صَرف کرتی ہے تو سرمایہ کاری کے اس عمل کو امریکی ریاست اس طرح منظم کرے کہ سرمایہ کے ارتکاز کے فوائد صرف امریکہ میں ظہور پذیر ہوں ورنہ امریکی ریاست عالمی سرمایہ دارانہ نظم اور طرز زندگی کی پشت پناہی سے دست کش ہو جائے۔

جمہوری عمل نے اس عام محروم امریکی کو یہ موقع فراہم کردیا کہ وہ ایک نسبتاً سوشل ڈیموکریٹک ریاستی طرز کو ایک قوم پرست (fascist) ریاست میں تبدیل کرنے کی راہ ہموار کردے۔ٹرمپ نے اس عام ''محروم'' امریکی کا گلوبلائزیشن مخالف ایجنڈا اپنا لیا لیکن اس کا امکان کہ وہ امریکی ریاست کو ازسرنو قوم پرستانہ بنیادوں پر منظم کرسکیں گے، فی الحال محدود نظر آتا ہے۔ایک ساتھ تین بڑی رکاوٹیں ہیں، ایک میڈیا جو تقریباً پورے کا پورا گلوبل مقتدرہ اور یہودیوں کی گرفت میں ہے۔دوسرے امریکی سودی اور سٹہ کاری کی مارکیٹ (Financial Market) جس کا انحصار بڑی حد تک بیرونی قرضوں اور ترسیلات پر ہے۔تیسرے امریکی فوج جو بیرونی محاذوں سے واپس اور اپنے بجٹ میں کٹوتی بہت مشکل سے قبول کرے گی۔ٹرمپ کی سب سے اہم کمزوری یہ ہے کہ اس نے موجودہ امریکی ریاستی ڈھانچہ کو تبدیل کرنے کے لئے کوئی ایسی تیاری نہیں کی جیسے ہٹلر نے نازی پارٹی کو منظم کرنے کے لئے کی تھی۔اس کے پاس نہ کوئی قوم پرست فوج موجود ہے نہ حکومتی بیوروکریسی اور نہ لوکل ایڈمنسٹریشن۔ اس کو اپنی قوم پرستانہ پالیسیوں کی تشکیل اور تنفیذ کے لئے اسی فوج،نوکرشاہی، پولیس اور ماہرین پر انحصار کرنا پڑے گا

جو پچھلے چالیس سال سے گلوب میں کارفرما ہیں اور جس کے ضوابطِ عمل اس مقتدرہ نے نہایت عرق ریزی اور تدبّر سے مرتّب کیے ہیں۔

ٹرمپ برسر اقتدار آ کر امریکی ریاستی ڈھانچہ کو کمزور ضرور کر دیں گے لیکن کیا وہ اس کی قوم پرستانہ ترتیب نو میں کامیاب ہوں گے؟ اس کے بارے میں تیقّن سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر موجودہ ریاستی مقتدرہ نے ان کو اپنے کیے وعدوں سے انحراف پر مجبور کر دیا تو ان کے حمایتی خاموش نہ بیٹھیں گے اور جمہوری جدوجہد عوامی مزاحمت اور عسکری جدوجہد میں تبدیل ہونے کے امکانات ہیں۔ اگر انہوں نے قوم پرستانہ ایجنڈا زور وشور سے نافذ کیا تو ریاستی اور معاشی مقتدرہ کا ردعمل شدید ہوگا۔ ابھی سے مغربی ساحلی صوبوں میں وفاق سے علیحدگی اور کینیڈا سے ادغام کی تحریکیں ابھرنے لگی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ٹرمپ قتل کر دیئے جائیں اور ان کے نائب Mike Pence تو ایک عام معتدل روایتی Republican سیاست دان ہی ہیں۔

اسلامی انقلابی جماعتیں اور جمہوری عمل کا استعمال

ٹرمپ کی فتح سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جمہوری عمل کو استعمال کر کے ریاستی مقتدرہ کے خلاف بغاوت کی جاسکتی ہے لہٰذا اسلامی انقلابی جماعتوں کو انتخابات میں ضرور حصہ لینا چاہیے۔ جمہوری عمل کے حلال ہونے پر (فرض ہونے پر نہیں) عصری علماء کا اجماع ہے اور دور حاضر میں جمہوری عمل عوام کو متحرک اور منظم کرنے کا شرعاً جائز اور مفید ذریعہ ہے۔

لیکن ہمیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ ہم سرمایہ دارانہ طرز اور نظم ریاست کے خلاف ایک بیرونی انقلاب برپا کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں کسی اندرونی سرمایہ دارانہ انقلاب کو برپا کرنے کی کوشش نہیں کر رہے۔ ہم سرمایہ دارانہ ریاستی نظام کا انہدام چاہتے ہیں، لبرل ریاستی نظام کو سوشل ڈیموکریٹ سے یا اشتراکی نظام کو قوم پرست نظام سے تبدیل نہیں کرنا چاہتے، اس لئے ہمارا کام سرمایہ دارانہ اندرونی انقلاب برپا کرنے والوں سے زیادہ کٹھن ہے۔ سرمایہ دارانہ اندرونی انقلاب برپا کرنے والے عوام سے تبدیلیٔ اقتدار اور تزکیۂ نفس کا مطالبہ نہیں کرتے۔ ٹرمپ کے حامی اور مخالفین دونوں ہی سرمایہ دارانہ اقدار، آزادی، مساوات اور ترقی کے پرستار ہیں اور دونوں کے کردار یکساں ہیں۔ ان میں فرق صرف مفادات کے تعین کا ہے۔ ٹرمپ نے نفسی تبدیلی لانے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ انہوں نے عوام اور مقتدرہ کے مفادات کے

تضادات اجاگر کر کے قوم پرستانہ انقلاب لانے کی کوشش کی لیکن اسلامی انقلابی جدوجہد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرز اور نظام ریاست کی طرف مراجعت ہے۔اگر ہمارا جمہوری انقلابی ایجنڈا لبرل یا سوشل ڈیموکریٹ یا قوم پرستانہ ہوتو ہم کبھی عوام میں اسلامی تحرک اور اسلامی انقلابی تنظیم نہ پیدا کر سکیں گے۔بلکہ ہماری انتخابی جدوجہد محض سرمایہ دارانہ عدل کے قیام کی جدوجہد ہوگی اور اس جدوجہد میں ہم جتنا کامیاب ہوں گے اتنا زیادہ ہماری جماعتیں سیکولر ہوتی چلی جائیں گی۔اگر ہمارا انتخابی ایجنڈا سوشل ڈیموکریٹ یا قوم پرستانہ ہواتو ہم عوامی اسلامی عصبیت کو ابھارنے کا کام کیسے کر سکیں گے؟

عوامی اسلامی عصبیت کو ابھارنے کے لئے اسلامی انقلابی جماعتوں، مصلحین کی جماعتوں، مدارس، خانقاہوں اور روایتی برادریوں کا اشتراک عمل لازم ہے۔اسلامی انقلابی عمل کی کامیابی کا دارومدار سب سے زیادہ تطہیر نفس اور اصلاح معاشرہ کے کام کے فروغ پانے پر منحصر ہے لیکن اسلامی انقلابی جماعتیں عوامی تطہیر نفس اور اصلاح نفس کا کام نہیں کر سکتیں یہ ان کا کام ہی نہیں یہ تو علماء کرام، صوفیاء اور مصلحین کی جماعتوں کا دائرہ کار ہے۔ہمیں اس بات کا ادراک ہونا چاہیے کہ انقلابی اسلامی جدوجہد اقامت دین کا محض ایک شعبہ ہے اس سے کہیں زیادہ اہم تزکیہ نفس اور اصلاح معاشرہ کا کام ہے کیونکہ اسلامی انفرادیت غیر اسلامی ریاست میں بھی پنپ سکتی ہے اس کے برعکس اسلامی انفرادیت کی عدم موجودگی میں اسلامی ریاست کا قیام ناممکن ہے۔

اس لئے اسلامی انتخابی جدوجہد کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ تزکیۂ نفس و تطہیر معاشرہ کے کام سے پیوست ہو۔کسی اسلامی جماعت یا گروہ تبلیغی جماعت، دعوت اسلامی، دینی مدارس کے وفاقوں کے لئے یہ ممکن نہ رہے کہ وہ اسلامی انتخابی ایجنڈا کی پشت پناہی سے براءت اختیار کرے۔یہی اسلامی انقلابی جماعتوں کی اصل (Constituency) ہے اور ہمیں ان کو اس بات کا قائل کرنا ہے کہ۔

اے بھائی اگر تم ساتھ نہ دو
تو ہم سے اکیلے کیا ہوگا؟
ماں جائے اگر تم ساتھ نہ دو
تو ہم سے اکیلے کیا ہوگا؟

ٹرمپ کی کامیابی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انتخابات کے انقلابی استعمال کے لئے عوام کو جذباتی بنیادوں پر متحرک کرنا ضروری ہے عقلی دلائل اس ضمن میں بالکل ہی بے کار ہیں۔ٹرمپ کامیاب اس لئے ہوئے کہ وہ ایک عام امریکی کے غصہ، غضب، حسد اور جذبۂ انتقام کو مہمیز دے سکے لہذا اسلامی انقلابی جماعتوں کو ۲۰۱۸ء کے انتخابات میں ضرور حصہ لینا چاہیے انتخابی ایجنڈا خالصتاً اسلامی ہو، عوام کے حقوق فراہم کرنے کے وعدوں کے ذریعہ ان کے حرص اور طمع کو مہمیز نہ دی جائے یہ اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارنے کے مترادف ہوگا۔کسی سیکولر جماعت سے کسی سطح پر کوئی understanding یا Adjustment نہ کی جائے۔زیادہ سے زیادہ اسلامی جماعتوں کو متحدہ مجلس عمل کے پلیٹ فارم پر جمع کر کے ایک ہی ایجنڈے پر الیکشن لڑا جائے۔

ہمارا بنیادی نعرہ ''اسلام خطرہ میں ہے'' ہونا چاہیے اور ہماری مہمات خالصتاً جذباتی مثلاً حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، توہینِ شعائرِ اسلام، تحفظ مساجد و مدارس وغیرہ پر مرکوز ہونی چاہیے۔اس طریقے سے ہم جذباتی بنیادوں پر غیر سیاسی اسلامی گروہوں کے لئے ناممکن بنا دیں گے کہ وہ ہماری انتخابی جدوجہد سے لاتعلق رہیں۔

انتخابی مہمات میں اس بات کی خصوصی کوشش کی جائے کہ قیادت پیروں اور وسیع حلقہ رکھنے والے شیوخ علماء کی ہو۔کم از کم پختونخواہ میں ایک متبادل سول انتظامیہ، اسلامی عدلیہ اور دفاعی اداراتی صف بندی کی جائے تاکہ کامیابی کے نتیجہ میں ریاستی اقتدار سیکولر ریاست کے منتظمین سے اسلامی انقلابی کارکنوں کے ہاتھوں میں منتقل کرنے کا عمل شروع کیا جاسکے۔

ڈاکٹر محمد امین

اس مضمون پر ہمارا تبصرہ

۱۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کا پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں کو 'انقلابی اسلامی جماعتیں'' کہنا اور ان کی کوششوں کو 'انقلابی اسلامی جدوجہد'' کہنا تعجب خیز ہے کیونکہ اب تو خود دینی سیاسی جماعتوں نے 'اسلامی انقلاب'' کا نعرہ ترک کر دیا ہے اور وہ غلبۂ دین اور نفاذ شریعت کی بجائے 'تحفظ شریعت' کانفرنسیں منعقد کر رہی ہیں اور 'اسلام بچاؤ' مارچ کر رہی ہیں۔

۲۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مغرب کی لادین سرمایہ دارانہ جمہوریت میں چند لفظی

اضافے سے وہ ''اسلامی جمہوریت'' کیسے بن جاتی ہے؟ اور اس سے وہ نتائج کیسے نکل سکتے ہیں جو اسلام کو سیاسی شعبے میں درکار ہیں؟ جب کہ ہم سب کا مشاہدہ یہ ہے کہ اس کاغذی اسلامی جمہوریت اور پاکستان میں دینی سیاسی جماعتوں کی انتخابی سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں یہاں اسلام تو نہیں آیا البتہ مغرب کی لادین تہذیب ضرور غالب آ گئی ہے۔

۳۔ مغربی جمہوریت سے امریکہ میں تو ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں ''انقلاب'' یعنی بڑی تبدیلی آسکتی ہے لیکن اسلام کے نام پر قائم کی گئی مملکت خداداد پاکستان میں لادین مغربی جمہوریت کے ذریعے اسلامی تبدیلی ہرگز نہیں آسکتی البتہ دین سے دوری ضرور پیدا ہوسکتی ہے۔

۴۔ پاکستان میں مولانا مودودیؒ اور دوسرے علماء کرام نے مغرب کی لادین جمہوریت میں چند اسلامی اصول داخل کر کے جس کاغذی اسلامی جمہوریت کے جواز کا فتویٰ دیا تھا، وہ تجربہ ناکام ثابت ہو چکا ہے لہٰذا علماء کرام کو چاہیے کہ اس بارے میں نیا فتوی دیں اور نیا اجتہاد کریں۔ اس بارے میں البرہان دسمبر ۲۰۱۶ء میں ہمارا تفصیلی مضمون ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ یہ کہنا بھی محض سادگی بلکہ سادہ لوحی ہے کہ اسلامی جذبات کو ابھار کر اگلے انتخابات میں دینی سیاسی جماعتیں کامیاب ہوسکتی ہیں۔ کیونکہ اصل مسئلہ عوام کے اسلامی جذبات ابھارنے کا نہیں، بلکہ لوگ اسلام کے بارے میں پہلے سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں (''پیو'' سروے سے بھی ہماری رائے کی تائید ہوتی ہے) اصل مسئلہ یہ ہے کہ دینی جماعتیں نفاذ اسلام اور اسلامی تناظر میں لوگوں کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت کے حوالے سے عوام میں اپنی کریڈیبلٹی اور اعتماد کھو چکی ہیں لہٰذا اس کام کے لیے عوام انہیں ووٹ نہیں دیتے اور نہ دیں گے۔

پس عوام کے ووٹوں سے علماء اور دینی جماعتیں کبھی انتخاب نہیں جیت سکتیں۔ بلکہ اکثر دینی جماعتیں بٹ چکی ہیں اور مٹ چکی ہیں۔ جمعیت علماء اسلام (ف) اور جماعت اسلامی کے پاس محض چند نشستیں رہ گئی ہیں۔ پچھلے انتخاب میں جماعت اسلامی کے قائدین کو چند سو ووٹ ملے تھے اور ان کی ضمانتیں ضبط ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر انصاری صاحب جیسا دانشور اب انہیں اگلا انتخاب لڑنے پر اکسا کر مزید کتنا خوار کرنا چاہتا ہے جب کہ ان کی کامیابی کا دور دور تک کوئی امکان نہیں۔

یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ۱۹۷۰ء کے انتخاب میں شکست کے بعد مولانا مودودیؒ کاغذی اسلامی جمہوریت میں انتخابی جدوجہد کے ذریعے کامیاب ہو کر اقامت دین کے

تصور سے تائب ہو گئے تھے اور اسے چھوڑ کر وہ جماعت کو اصلاح فرد اور معاشرہ کے منہج پر واپس لانا چاہتے تھے لیکن ایک ہمارے ڈاکٹر انصاری صاحب ہیں جو پھر جماعت کو اگلا الیکشن لڑنے اور جیتنے کے خواب دکھا رہے ہیں۔

۶۔ امریکہ میں جمہوریت کے ذریعے کامیابی اور پاکستان میں جمہوریت کے ذریعے انتخاب جیت کر اسلام نافذ کرنا دونوں میں کوئی قدرِ مشترک نہیں لہٰذا ٹرمپ کی کامیابی کو پاکستان میں دینی جماعتوں کی کامیابی سے ملانا اور ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا صحیح نہیں، یہ قیاس مع الفارق ہے۔ تفصیل کے لیے اصول فقہ کی کسی کتاب میں قیاس کی فنی بحث دیکھی جا سکتی ہے۔

۷۔ اتنے اختلافات کے باوجود ہمیں ڈاکٹر صاحب کے تجزیے کی دو باتوں سے بھرپور اتفاق ہے۔ ایک یہ کہ ڈاکٹر صاحب دینی جدوجہد میں تقسیم کار کے قائل ہیں۔ بجا طور پر وہ کہتے ہیں کہ معاشرے میں دینی جدوجہد کی کامیابی کا انحصار افراد کے تزکیے اور معاشرے کی اصلاح پر ہے اور یہ دینی سیاسی جماعتوں کا کام ہی نہیں بلکہ یہ صوفیاء اور اصلاحی و تبلیغی جماعتوں کا کام ہے۔ دینی سیاسی جماعتوں کا کام یہ ہے کہ وہ ان اصلاحی اداروں اور جماعتوں کا تعاون حاصل کریں۔ ڈاکٹر صاحب کے تجزیے کی دوسری صحیح بات (کا پہلا جزء) یہ ہے کہ ہماری دینی سیاسی جماعتیں اس وقت تک انتخاب نہیں جیت سکتیں جب تک وہ متحد نہ ہوں۔ لیکن یہ بات جتنی سادہ اور سہل لگتی ہے عملاً اتنی ہی مشکل ہے کیونکہ ہماری دینی سیاسی جماعتیں بوجوہ (اور ان وجوہ کی تفصیل میں جانا یہاں مناسب نہیں) متحد ہونے کو تیار نہیں۔ اس صحیح بات کا دوسرا جزء یہ ہے کہ دینی سیاسی جماعتوں کی کامیابی کا انحصار اصلاحی و تبلیغی جماعتوں کی حمایت حاصل کرنے پر ہے لیکن ہمارے دینی مدارس، صوفیوں اور اصلاحی و تبلیغی جماعتوں کا ناقص تصورِ دین انہیں سیاسی کام کی حمایت یا عوامی مسائل کے حل کی طرف متوجہ ہی نہیں کرتا۔ لہٰذا یہ دو امور جن پر دینی سیاسی جماعتوں کی کامیابی کا انحصار ہے، ان کے عملاً وجود میں آنے کے امکانات بہت کم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب تو بحیثیت دانشور ان کاموں کی تجویز دے رہے ہیں لیکن ہم تو برسوں سے یہ دونوں کام کر رہے ہیں اور اس کے تلخ اور مایوس کن نتائج کا ہمیں خوب تجربہ ہے۔ گو ہم مایوس نہیں ہیں اور اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اسلام اور مغرب پروفیسر ڈاکٹر خالد علویؒ

اسلام اور گلوبلائزیشن (آخری قسط)

اُمت کے آفاقی تصور کا استحکام

روحانی لائحہ عمل کا دوسرا نکتہ امت کا عالمی تصور ہے۔ اسلام کا تصورِ آفاقیت روحانی بھی ہے اور مثبت بھی۔ امت مسلمہ رنگ و نسل اور جغرافیائی وحدتوں کی بجائے ایک روحانی الاصل گروہ ہے جو آفاقی (Transnational) ہے۔ توحید اس تصور کو مستحکم کرتی ہے۔ رسالت اجتماعیت کو مضبوط بناتی ہے اور کعبۃ اللہ ایک مرکز پر مجتمع کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کے بارے میں کہا ہے:

i UsçDLqm¿ j UzyþDpj aDy. ky j UzH¶ LB3 Lø Lò LH

لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ ⑴

لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہیں مختلف گروہ اور قبیلے بنایا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ کے ہاں تم میں سے وہ شخص قابل تکریم ہے جو زیادہ متقی ہے۔

قرآن مزید کہتا ہے:

⑵ °lADVsULa j UMLBDjFVUDuy j Uny BXSAU

یہ تمہاری امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا ربّ ہوں۔ پس تم میری عبادت کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

⑶ °lj ýrF"Y¶"j DaZHLGaF"Y¶"LB`

میں آخری نبی اور تم آخری اُمت ہو۔

⑴ الحجرات ۴۹: ۱۳

⑵ الانبیاء ۲۱: ۹۲، المومنون ۲۳: ۵۲۔ اس میں فاعبدون کی جگہ فاتقون ہے۔

⑶ ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنۃ الرجال ۵۹۱، مکتبہ دار السلام ریاض

اس امت کی ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قرآن نے کہا:

[illegible]

عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴿۱﴾

یعنی اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک میانہ رو امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم پر گواہ ہوں گے۔

مسلمانوں کو عالمی روحانی قوت بننے کے لیے کسی نئے فریم ورک پر کوئی بڑی جدوجہد کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی بنیادیں موجود ہیں، تصور موجود ہے، مسلمان عوام کے اندر تڑپ موجود ہے، اسے صرف منظّم اور متحرک کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کے دشمنوں نے اُمت کے اس تصور کو ختم کرنے کے لیے قومیت کی تحریک متعارف کرائی اور دورِ استعمار میں عالم اسلام کو ٹکڑوں میں بانٹا اور چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کو مستحکم کرنے اور باہم دگر لڑانے کے لیے منصوبہ بندی کی۔ چونکہ امت روحانی اساس اور نظریاتی تصور پر قائم ہے اس لیے اسلام کے خلاف جارحانہ مہم چلائی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ احیاء امت کے اس تصور کو فکری اور نظریاتی طور پر مستحکم کیا جائے۔ چونکہ امت کی شناخت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قیادت سے ہے لہٰذا حبِ رسول اور اتباعِ رسول کو محکم کرنے کے انتظامات کیے جائیں تا کہ خطرات کا مقابلہ کیا جا سکے۔

اخلاقی قدروں کا استحکام

روحانی لائحہ عمل کا تیسرا نکتہ اخلاقی قدروں کا استحکام ہے۔ مغرب نے سیکولرائزیشن کے تحت اخلاقی قدروں کو اضافی قرار دیا ہے اور وہ صرف انہی قدروں کا فروغ چاہتے ہیں جنہیں وہ دوست رکھتے ہیں۔ اسلام ہمیں مستقل اور پائیدار قدروں سے روشناس کراتا ہے۔ لہٰذا اخلاقی قدروں کی تغیر پذیری کو سختی سے رد کر دینا چاہیے اور مسلمان معاشروں میں نئی اقدار کی مزاحمت کرنی چاہیے۔ حیاء، عفت، غیرت، عدل، احسان، معروف و منکر اور شفقت و رحمت جیسی قدروں پر ہی معاشرے کا وجود منحصر ہے۔ یہ ختم ہو گئیں تو معاشرے کا اسلامی تشخص ختم ہو جائے گا۔ عالمگیریت دنیا میں فحاشی، بدکرداری، بے حیائی، بے غیرتی، خودغرضی اور ظلم کو نافذ کرنا چاہتی ہے۔ مسلمان معاشرے اپنی روحانی اساس کے استحکام میں اسلام کی عطا کردہ اخلاقی قدروں کی

﴿۱﴾ البقرہ ۲: ۱۴۳

حفاظت کریں۔ یہی ان کی اصل قوت ہے۔ مسلمان معاشرے اگر داخلی طور پر مضبوط ہوں گے اور افراد معاشرہ کا شعور بیدار ہوگا تو خارجی اثرات کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ عالمگیریت کے پروگرام میں داخلی تضادات کو ابھارنا اور اخلاقی بنیادوں کو کمزور کرنا شامل ہے۔ چونکہ عالمگیریت کو طاقتور میڈیا کی حمایت حاصل ہے اس لیے اس قوت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

مسلمان معاشروں کی اصل قوت ان کا روحانی تشخص ہے اور اسی پر ساری مزاحمت کا دارومدار ہے۔ ہمارے ہاں مذہبی اختلافات موجود ہیں اور گروہی وفاداریوں کی بنیاد پر اجتماعی قوت کمزور ہوچکی ہے۔ عالمگیریت مغرب کے اتحاد کا مظہر ہے اور مسلمانوں کو مغلوب کرنے کا ذریعہ ہے اور اگر ہمارے فرقہ وارانہ اختلافات بڑھ گئے تو پھر عالمگیریت بغیر کسی مزاحمت کے کامیاب ہوجائے گی۔ شعورِ اُمت کی پختگی، وحدت امت کا ادراک اور فرقہ وارانہ رواداری سے ہم روحانی تشخص کو مضبوط کرسکتے ہیں۔ یہی بچاؤ کا ذریعہ ہے اور اسی سے ہم وہ متبادل نظام دینے کے قابل ہوں گے جس میں انسانیت کی اصلاح وفلاح مضمر ہے۔

مادی لائحہ عمل

مسلمان ممالک کا اجتماعی پلیٹ فارم موجود ہے لیکن مغرب نے اس کے اندر نقب لگائی ہوئی ہے۔ بعض ممالک دانستہ طور پر عالمی استعمار کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ او آئی سی میں یوگنڈا جیسے ممالک بھی شامل ہیں جس کا صدر عیسائی ہے اور مسلمان اقلیت میں ہیں۔ او آئی سی کو امت مسلم کا نمائندہ ہونا چاہیے اور بنیادی طور پر وہی ممالک اس کے رکن ہونے چاہئیں جہاں حکومتیں مسلمان ہیں۔ مسلم اقلیات کی شمولیت کا الگ نظام وضع کرنا چاہیے تاکہ پالیسی بناتے وقت کوئی غیر مسلم اس میں شامل نہ ہو۔ یہ خطرہ تو ہمیشہ رہے گا کہ کوئی مسلمان استعمار کا جاسوس ہو اور ذاتی اغراض کے لیے امت سے غداری کرے لیکن جانتے بوجھتے غیر مسلم کو امت کے اجتماعی پلیٹ فارم میں شامل کرنا حماقت کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟ بدقسمتی سے او آئی سی نے اپنا کردار ادا نہیں کیا اور عملاً استعمار کے ہاتھ میں کھلونا ثابت ہوئی ہے۔ اسے صحیح خطوط پر منظّم کرکے اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔ مادی لائحہ عمل میں جہاں مشترکہ پلیٹ فارم کی مضبوطی اور عمدہ تنظیم شامل ہے وہاں کچھ اور اقدام بھی ضروری ہیں جو مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

معیشت کا اپنا نظام

مغربی استعمار کے آغاز سے اب تک دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کا غلبہ چلا آ رہا ہے۔ ستّر سال کے قریب اشترا کی نظام نے متبادل معاشی تنظیم مہیا کی لیکن سرمایہ دار نے اس کا مقابلہ کیا۔ وقتی حک واضافہ کے ساتھ اس نے اپنا دباؤ جاری رکھا اور بالآخر اشترا کی نظام بکھر گیا۔ اس دوران میں عوامی بہبود کے پروگرام متعارف کرائے، غریب ملکوں کو امداد دینے کے انتظامات کیے لیکن زیادہ توجہ مغربی مما لک کے عوام پر رہی۔ ان کا معیارِ زندگی بلند کیا گیا، انہیں سہولتیں مہیا کی گئیں اور عوامی فلاح کے بہت سے پروگرام متعارف کرائے گئے۔ ترقی کے نئے پیمانے متعارف کرائے گئے اور غریب ملکوں کو قرض دے کر سود کی صورت میں اپنی معیشتوں کا انتظام کیا گیا۔ نام نہاد ترقی یافتہ مما لک کے مختلف کنسورشیم بنائے گئے جو تیسری دنیا کے ملکوں کو دیے جانے والے قرضوں کی تنظیم کرتے ہیں اور ان ملکوں سے سودی قسطوں کا بہاؤ جاری رہتا ہے تا کہ ان مما لک کی مستقل آمدنی کا وسیلہ قائم رہے۔ ناروے جیسا چھوٹا ملک قرض دینے کی پوزیشن میں ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی پوری اٹھان استحصال پر ہے۔ سرمایہ وسیع پیمانے پر اشیاء تیار کر کے مارکیٹ میں لے آتا ہے اور پھر انتظام کرتا ہے۔ ایشیاء اور افریقہ کے بعض مما لک استعماری دور میں خام مال کے مراکز کے طور پر متعین کیے گئے جو اب تک چل رہے ہیں۔ ان مما لک میں قحط، غربت اور پسماندگی ہے جب کہ ان کے خام مال پر چلنے والا سرمایہ دار دن بدن فربہ ہو رہا ہے۔ اس کی تجوریاں بھر رہی ہیں اور اس کے عشرت کدے آباد ہو رہے ہیں۔ اس استحصالی نظام کی بنیاد سود اور جوا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے بنکوں کے نظام کو مستحکم کیا اور اسٹاک ایکسچینج کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جو مفروضوں پر مبنی ہے۔ یہی نظام قیمتوں کا تعین کرتا ہے اور زر کی حیثیت متعین کرتا ہے۔ بڑے سرمایہ دار بازار حصص پر کنٹرول رکھتے ہیں اور (Speculation) کے ذریعہ سے زر کی قیمتوں کا تعین کرتے ہیں۔ حصص کی مارکیٹ معیشت کی قوت متعین کرتی ہے جو اکثر موہوم ہوتی ہے اور کسی وقت دھڑام سے گر سکتی ہے۔ عالمی ساہوکاروں نے پوری دنیا میں بنکوں اور سٹاک ایکسچینج کے اداروں کو متعارف کرایا اور اس طرح ہر ملک کی معیشت ان کے ہاتھ میں آ گئی۔ عالمی سرمایہ داروں کا ہاتھ نبض پر ہوتا ہے اور وہ کسی ملک کی موت وحیات کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۵۴)

ملی مجلس شرعی ادارہ

قتلِ غیرت کا قانون غیر اسلامی ہے

ملی مجلس شرعی کے زیر اہتمام تمام مکاتب فکر کے علماء کرام کا فیصلہ

ملی مجلس شرعی نے، جو تمام مکاتب فکر کے علماء کرام کی ایک علمی وفکری مجلس ہے، اپنے اجلاس مورخہ ۱۱ جنوری ۲۰۱۷ء میں جو جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور میں ہوا، قتل غیرت سے متعلق مرکزی حکومت کے پاس کردہ قانون کو غیر شرعی قرار دیا ہے۔ علماء کرام نے کہا کہ غیرت کی بنیاد پر قتل حالت اشتعال میں ہو تو شرع اسلامی کے علاوہ مغربی قانون اور پاکستانی قوانین میں بھی اس کی سزا کم ہوتی ہے لیکن حکومت نے قتل غیرت کو عام قتل کی مد سے نکال کر حرابہ میں ڈال دیا ہے جو کہ دراصل دہشت گردی، ڈکیتی اور فساد فی الارض کی سزا ہے نہ کہ معمول کے عام قتل کی۔ اس لیے حکومتی قانون غیر شرعی ہے اور ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اسے واپس لے۔

اجلاس کی صدارت مولانا مفتی محمد خاں قادری صاحب صدر مجلس نے کی جب کہ مہمان خصوصی مولانا محمد خاں شیرانی چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد تھے۔ انہوں نے مجلس کی علمی مساعی کی تعریف کی اور مختلف مکاتب فکر کے درمیان مجلس کی اتحادی کوششوں کو سراہا۔ مجلس نے سیکولر اور تشدد پسند بیانیے کے بالمقابل تمام مکاتب فکر کے نزدیک عادلانہ اور مشترکہ بیانیے کے مسودے پر بھی غور وفکر کیا۔ اجلاس میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، اہل تشیع، جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی کے ثقہ اور جید علماء کرام نے شرکت کی جن میں مولانا حافظ فضل الرحیم، مولانا زاہد الراشدی، حافظ نعمان حامد، ڈاکٹر حافظ سعد اللہ، مولانا ڈاکٹر راغب نعیمی، علامہ محمد خلیل الرحمن قادری، حافظ اسحق جیلانی، مولانا حافظ عبد الغفار روپڑی، قاری شیخ محمد یعقوب، مولانا حافظ عاکف سعید، مولانا ایوب بیگ مرزا، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، مولانا مجیب الرحمن انقلابی، ملک شہباز احمد، مولانا احمد وقاص، مولانا جاوید نوری اور دیگر علمائے کرام شامل تھے۔ نقابت کے فرائض ڈاکٹر محمد امین صاحب ناظم اعلیٰ نے ادا کیے۔

اسلام اور پاکستان ادارہ

پاکستان کا مخدوش اسلامی مستقبل۔قابل عمل اصلاحی تجاویز

’البرہان فورم‘ کے زیر اہتمام لاہور میں ایک علمی مذاکرہ

ماہنامہ البرہان پچھلے کچھ عرصے سے اس بات کو سامنے لا رہا ہے کہ پاکستان کا اسلامی مستقبل مخدوش نظر آتا ہے لہٰذا اس کے لیے موجودہ کوششوں کے علاوہ، مزید کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس پر اصحاب علم و فضل نے جو کچھ لکھا وہ البرہان کے شمارہ اکتوبر ۲۰۱۶ء میں شائع کر دیا گیا۔ ۵ جنوری ۲۰۱۷ء کی شام مدیر البرہان نے عامر ہوٹل میں لاہور کے منتخب دانشوروں، صحافیوں، پروفیسرز، علماء کرام کو اکٹھا کیا اور اس موضوع پر سوچ بچار کی دعوت دی۔ انہوں نے موضوع کا افتتاح کرتے ہوئے کہا:

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ پاکستانی معاشرہ اس وقت دینی، اخلاقی اور تہذیبی بحران سے دو چار ہے۔ لوگ نہ صرف دین و اخلاق سے دور ہو رہے ہیں بلکہ مغربی تہذیب کی اقدار نے اسلامی اصول و اقدار کی جگہ لے لی ہے جس کا سبب میڈیا، مخلوط تعلیم، مغربی جمہوریت، سیکولرزم، مادہ پرستی وغیرہ ہیں۔ ایک تاثر یہ بھی ہے کہ ہمارے حکمران اور شرافیہ تو مغرب زدہ تھے ہی ہمارے دینی عناصر بھی اس صورت حال کا تدارک کرنے میں کوئی موثر کردار ادا نہیں کر سکے۔ دینی مدارس اور تبلیغی و اصلاحی جماعتوں کا تصور دین انہیں مغربی تہذیب یا معاشرے و ریاست کے مسائل کی طرف متوجہ ہی نہیں کرتا۔ دینی سیاسی جماعتیں بھی ناکام ہو چکی ہیں۔ دینی قوتوں کے غیر موثر ہونے کی ایک وجہ ان کا باہمی انتشار اور دین کی جگہ مسلک کو دے دینا بھی ہے۔

ان حالات کے نتیجے میں پاکستان کا اسلامی مستقبل مخدوش نظر آتا ہے اور درد مند افراد کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ: اس صورت حال کی اصلاح کیسے کی جائے اور کون کرے؟ انہوں نے شرکاء سے درخواست کی کہ ان دو سوالوں کا جواب دے کر وہ ان کی اور قوم کی رہنمائی فرمائیں۔

جن اصحاب علم و فضل نے اس موقع پر اپنے خیالات کا ظہار کیا ان کی آراء کا خلاصہ درج ذیل ہے:

مولانا مفتی محمد خاں قادری (صدر ملی مجلس شرعی و مہتمم جامعہ اسلامیہ لاہور)

حالات واقعی تشویشناک ہیں اور صحیح سمت میں غور و فکر اور عمل کا تقاضا کرتے ہیں۔ میرے نزدیک اس کا فوری اور عارضی حل یہ ہے کہ اساتذہ کے ساتھ نشستیں کی جائیں، ان کی تربیت کی جائے اور انہیں متحرک و فعال کیا جائے۔ اسلام کے بارے میں تصور کی درستی بھی ضروری ہے۔ ہماری اکثریت صرف نماز روزے ہی کو دین سمجھتی ہے حالانکہ صلہ رحمی، امانت داری، محتاجوں مسکینوں کی مدد، مظلوموں کی دادرسی، مہمان نوازی جیسی اقدار کم اہم نہیں جن پر ہمارے رسول ﷺ نبوت سے قبل بھی عمل پیرا تھے۔

مستقل حل یہ ہے کہ رجال کار تیار کیے جائیں۔ لوگ رسوخ فی العلم سے محروم ہیں اور فرقہ واریت میں پڑے ہوئے ہیں۔ جدید اور مذہبی تعلیم دونوں کے فارغ التحصیل طلبہ کی متوازن اور جامع تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔ اسلام کو بطور متبادل نظام حیات پڑھانا اور پیش کرنا چاہیے نہ کہ بطور مذہب۔

ڈاکٹر ابصار احمد (سابق صدر شعبہ فلسفہ جامعہ پنجاب و صدر انجمن خدام القرآن۔ برادر خورد ڈاکٹر اسرار احمدؒ)

بعض مغرب زدہ لوگ اپنے گمراہ کن افکار کے فروغ کے لیے میڈیا میں سرگرم عمل ہیں لیکن ہمیں اس کے تدارک کی کوئی فکر نہیں مثلاً جی سی یونیورسٹی لاہور کے ڈاکٹر طاہر کامران 'دی نیوز' میں لکھتے ہیں۔ ۲۵ دسمبر کو یوم قائداعظم کے حوالے سے ان سے سوال کیا گیا کہ قائداعظم کن لوگوں سے متاثر تھے تو انہوں نے جواب میں بہت سے غیر مسلموں کے نام گنوائے لیکن علامہ اقبال، محمد علی جوہر اور کسی مسلمان کا نام لینا انہوں نے گوارا نہ کیا۔ یہی حال آئی ٹی یونیورسٹی کے ڈاکٹر بنگش کا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ گروپ بنائیں، وفد تشکیل دیں اور متعلقہ اداروں کے سربراہوں اور ذمہ داروں سے ملیں اور انہیں صورت حال کی نزاکت سے آگاہ کریں۔

مسرور اعظم فرخ (پبلک ریلشینز آفیسر آفاق: کالم نگار اور مدیر جہانِ علم)

یہ موضوع وہی ہے جس پر ہم مسلمانوں کے عروج و زوال کے حوالے سے بحث کرتے

آئے ہیں۔ تاتاریوں نے بھی مسلمانوں کو شکست دی لیکن یہ شکست فکری وتہذیبی سے زیادہ عسکری تھی اور بالآخر مسلمان ان فاتحین کو علمی وفکری طور پر زیر کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن موجودہ صورت حال زیادہ گھمبیر ہے اور مغربی فکر وتہذیب اور اس کے علمبردار ممالک نے مسلمانوں کو صرف عسکری میدان ہی میں شکست نہیں دی بلکہ ان کے دل ودماغ کو بھی فتح کیا ہے لہٰذا مغرب کی فکری غلامی سے آزاد ہونے کے لیے ہمیں اپنے نظام تعلیم اور نصابات کو بدلنا ہوگا۔

علامہ محمد خلیل الرحمن قادری (ناظم اعلیٰ جامعہ اسلامیہ لاہور، ورجینل ڈائریکٹر 'اسلامک ہیلپ' یوکے)

بے دینی اور مغرب پرستی کے خلاف تحریک چلانا بہت ضروری ہے لیکن افرادی وسائل کے ساتھ مادی وسائل بھی ناگزیر ہوتے ہیں اور لوگ فنڈز دیتے ہیں جماعتوں کو لیکن بامر مجبوری کہنا پڑتا ہے کہ دینی جماعتیں ڈیلیور نہیں کر سکیں اور متبادل کوششوں کی ضرورت ہے۔ تعلیم کے ساتھ میڈیا بہت اہم ہے خصوصاً سوشل میڈیا پر کام کرنا ناگزیر ہے۔ دعوت اور خصوصاً خطبہ جمعہ کو موثر بنایا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ موضوعات کا انتخاب کر کے اس پر ضروری مواد ان کو مہیا کیا جائے۔ وطن عزیز میں غیر اسلامی قانون سازی ہونا شروع ہو گئی ہے، اس کو چیک کرنا بھی ضروری ہے۔ اعلیٰ سطح پر علمی، دعوتی اور تحقیقی پیش رفت کے لیے ایک تھنک ٹینک کا قیام بھی ناگزیر ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر میاں محمد اکرم (صدر تنظیم اساتذہ پاکستان وماہر معاشیات)

مغرب کی ایجنسیوں نے پاکستان میں نظام تعلیم کو ہدف بنا رکھا ہے اور وہ پبلک اور پرائیوٹ سیکٹر دونوں میں کام کر رہی ہیں۔ ان کا ایجنڈا یہ ہے کہ مسلمانوں کو لبرل بنایا جائے اور دین سے دور کر کے مغرب کو ان کا آئیڈیل بنا دیا جائے۔ لہٰذا ہمیں تعلیم کو مال تجارت سمجھنے کی بجائے اس سے اپنے نظریۂ حیات کے فروغ کا کام لینا چاہیے۔ علماء کا اتحاد معاشرے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ ہمیں ایک تھنک ٹینک کی بھی ضرورت ہے جو سروے کر کے حقائق سامنے لائے تاکہ زمینی حقائق کی بنیاد پر غلبۂ حق کے لیے جدوجہد کی جا سکے۔

ڈاکٹر علی اکبر الازہری (صدر شعبہ علوم اسلامیہ دی لاہور یونیورسٹی)

اسلام مخالف عالمی طاقتیں مسلم ممالک کی حدود از سر نو قائم کرنے کے لیے، خصوصاً مشرق وسطی کے مسلم ممالک میں، سرگرم عمل ہیں تاکہ انہیں مزید چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے کمزور اور

غیر مستحکم کیا جا سکے۔اس کے ساتھ مغرب کا ثقافتی حملہ بھی جاری ہے۔تعلیم اور میڈیا کے ساتھ علماء کا کردار بھی اہم ہے۔خطبہ جمعہ کو موثر بنانے کے لیے خطباء کی ٹریننگ کی ضرورت ہے اور ہمیں خطبے کے لیے اپنی مثبت موضوعات دینے چاہئیں۔تھنک ٹینک بنانا بہت ضروری ہے تا کہ اہل علم وفکر مل بیٹھ کر ملی مسائل پر غور کریں۔

پروفیسر ندیم غفور چودھری (کامسیٹ یونیورسٹی شعبہ آئی ٹی)

اس وقت سوشل میڈیا بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے لہٰذا ہمیں اس کی طرف توجہ دینی چاہیے اور اپنے نظریات کے فروغ ، اسلام مخالف قوتوں اور مغربی تہذیب کے الحادی افکار کے سامنے بند باندھنے کے لیے اس ذریعہ کو استعمال کرنا چاہیے۔انہوں نے کہا کہ پروفیسر نوم چومسکی اور دوسرے بہت سے وہاں کے دانشور خود مغربی فکروتہذیب کے خلاف لکھ اور بول رہے ہیں اور اس کی ناکامیوں کو نمایاں کررہے ہیں لیکن ہمیں اس کا علم ہی نہیں اور نہ ہم اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنا علم پیدا کریں اور تحقیق کے لیے اسلامی اور ملی مسائل اور مفادات کو موضوع بنائیں۔

علامہ شہزاد مجددی (مصنف،محقق،شاعر،مربی، پی ایچ ڈی سکالر)

معاشرے میں احیائے تزکیہ کی ایک فعال تحریک چلانے کی ضرورت ہے کیونکہ تربیت تعلیم سے زیادہ اہم ہے اور تعلیمی ڈھانچے سے باہر بھی اس کی ضرورت ہے۔موجودہ نظام اور اس کے ڈھانچے پر محض تنقید کافی نہیں بلکہ اس کا متبادل دینے کی ضرورت ہے۔جب تک ہم متبادل نہیں دیں گے کوئی عملی تبدیلی واقع ہونا مشکل ہے۔

پروفیسر سلیم اللہ اویسی (ڈائریکٹر علماء اکیڈمی ومرکز معارف اسلامیہ)

مرض کی تشخیص اور اس کے علاج کے لیے آج کی مجلس بہت مبارک ہے لیکن اسے ایک مستقل اور قابل اعتماد فورم کی شکل دی جانی چاہیے۔اور خواتین سمیت ہر شعبہ زندگی کے لوگوں کا اس میں خیر مقدم کرنا چاہیے تا کہ ایک کارواں کی شکل بن سکے اور معاشرے کو اسلامی اصولوں پر عمل کے لیے متحرک کیا جا سکے۔

ڈاکٹر محمد علی (پروفیسر ٹیکنالوجی، جامعہ پنجاب)

معاشرے کو اٹھانے میں تعلیم بہت اہم ہے۔ کورسز ضرور Customize ہونے چاہئیں اور طلبہ کی تعمیر سیرت و کردار میں دینی اصول و اقدار کے نفوذ کے لیے کوششیں ہونی چاہئیں۔

کموڈور (ر) طارق مجید (مصنف، دانشور، تجزیہ کار، پاک نیوی کے ریٹائرڈ کموڈور)

کموڈور صاحب ناسازی طبع کے باعث مجلس مذاکرہ میں تشریف نہ لاسکے البتہ انہوں نے اپنا تحریری موقف پیشگی بھجوا دیا۔ ان کی رائے یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں دینی، اخلاق، تہذیبی اور تعلیمی انتشار پیدا کرنے کی ذمہ دار نیو ورلڈ آرڈر کی تخلیق کرنے والی اور اسے دنیا میں نافذ کرنے والی قوت صیہونی قیادت ہے۔ اس کا مقابلہ غیر سیاسی افراد اور جماعتیں ہی کرسکتی ہیں جن میں جذبہ اور جرأت ہو۔ لہٰذا ہمیں ایک ایسا گروپ قائم کرنا چاہیے جس میں تجزیہ نگار، دانش ور، صحافی اور اساتذہ شامل ہوں۔ قوم کا درد رکھنے والے صنعت کاروں، تاجروں اور صاحب ثروت افراد سے اس کام کے لیے مالی تعاون حاصل کیا جائے اور یہ گروپ گہرے غور و فکر سے معاملات کا جائزہ لے، اصلاح کے لیے عملی اقدامات کا تعین کرے اور پھر ان پر عمل درآمد کرے۔

متین خالد (مصنف، محقق، رہنما تحریک ختم نبوت)

اس میں شک نہیں کہ سیاسی اور مذہبی قیادت نے لوگوں کو مایوس کیا ہے لیکن میری رائے میں پھر بھی پاکستان کا اسلامی مستقبل ان شاء اللہ روشن ہوگا، مخدوش نہیں کیونکہ ؎ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔ اس کے لیے ہمیں چاہیے کہ ہم نوجوانوں پر کام کریں، انہیں منظم و متحرک کریں اور ان کی قوت سے معاشرے کو بدلنے کی جدوجہد کریں۔

حافظ اسحاق جیلانی (صحافی و کالم نگار جہان پاکستان، نئی بات، خبریں)

نتائج کے لیے روایتی طریقوں سے باہر نکلنے کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ تعلیم اور خصوصاً تربیت اساتذہ کا کام بہت اہم ہے۔ اور میڈیا (پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل سب) پر بھی کام ہونا چاہیے بلکہ میری رائے میں سارے شعبہ ہائے زندگی میں کام کرنے کی ضرورت ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ سارے کام بیک وقت شروع کردیے جائیں بلکہ ترجیحات کا تعین کرکے پہلے ایک کام کو لیں اور پھر دوسرے کو۔ جماعتوں پر تنقید کا کوئی فائدہ نہیں، خود مثبت کام کرنا چاہیے۔

صابر بخاری (صحافی و کالم نگار روزنامہ نوائے وقت)

دینی موضوعات پر اچھا لکھنے والوں کی کمی ہے، اگر اچھا مواد تیار ہو اور وہ صحافیوں کو مہیا کیا جائے تو اخبارات ضروری چھاپیں گے۔ پریشر گروپ بھی ہونے چاہئیں۔ ایڈیٹروں، پروڈیوسروں، لکھنے والوں سے مل کر انہیں قائل کیا جانا چاہیے۔ ثقافتی اور ادبی مواد کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ ایک اچھے ڈرامے اور کہانی کے ذریعے بھی اپنا پیغام لوگوں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

ملک شہباز احمد (کالم نگار، رہنما کاروان اسلام)

مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام استحصال کا بنیادی ذریعہ ہے۔ اگر لوگوں کو دو وقت کی روٹی نہ ملے تو سب نظریے بھول جاتے ہیں۔ لہٰذا تعلیم اور میڈیا کے موثر استعمال کے ساتھ معیشت کی بہتری اور غریبوں اور محتاجوں کے مسائل حل کرنے کے بارے میں بھی ہمیں سوچنا چاہیے۔

بقیہ: اسلام اور گلوبلائزیشن

اقبال نے کہا تھا ؎

ایں بنوک ایں فکرِ چالاکِ یہود
نورِ حق از سینۂ آدم ربود
تا تہہ و بالا گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

مسلمان ممالک جب تک اپنا نظام معیشت ترتیب نہیں دیں گے اس وقت تک وہ سرمایہ دارانہ نظام کے چنگل سے نہیں نکل سکیں گے۔ اس نظام کی ترتیب کے کئی فکری و عملی زاویے ہیں جنہیں پیش نظر رکھا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے عالم اسلام کے معیشت دان ذہناً مغرب سے مرعوب ہیں کیونکہ وہ اس نظام کے پروردہ ہیں۔ مسلمان ممالک کی جامعات سرمایہ دارانہ معیشت کے ماڈل کو سامنے رکھ کر وہی کچھ پڑھا رہی ہیں جو مغرب میں پڑھایا جا رہا ہے۔ کوئی ایک مجتہد بھی نہیں پیدا ہوا جو سود اور سٹاک ایکسچینج کی لعنت سے پاک معاشی نظام مرتب کر کے دے۔ جب تک سود، سٹہ اور جوا ختم نہیں ہوگا اس وقت تک مسلمان مملکتوں کے پنپنے کی کوئی امید نہیں۔ عالمگیریت اسی سودی نظام کو مزید مستحکم کرنے کا نظام ہے جسے عالمی ساہوکار منظّم کر رہے اور چلا رہے ہیں۔

تبصرۂ کتب مدیر

’محاضراتِ تعلیم‘

از ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ

ڈاکٹر غازیؒ ہمارے معاشرے کے ان کمیاب لوگوں میں سے تھے جو دین کا گہرا علم بھی رکھتے تھے اور عصری تقاضوں اور ضرورتوں سے بھی آگاہ تھے۔ وہ چونکہ کثیر المشاغل تھے اس لیے باقاعدہ تصنیف و تالیف کا موقع انہیں زیادہ نہ ملا۔ اس کا متبادل انہوں نے سلسلہ محاضرات کی صورت میں نکالا اور یہ بہت اچھا ہوا کہ اس طرح ان کے علم و فکر کے ابلاغ کی ایک صورت پیدا ہوگئی۔ لاہور کے فیصل پبلشرز نے ان کے محاضرات قرآنی، محاضرات سیرت، محاضرات حدیث، محاضرات فقہ، محاضرات شریعت اور محاضرات معیشت و تجارت شائع کیے ہیں جن سے لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔

اب کراچی کے ڈاکٹر سید عزیز الرحمن صاحب نے علمی دنیا پر احسان کیا ہے کہ ڈاکٹر غازیؒ کی رحلت کے بعد تعلیم سے متعلق ان کی تقریروں کو جمع کر کے ’محاضرات تعلیم‘ کے نام سے انہیں طبع کر دیا ہے۔ یہ کاوش بہت عمدہ اور مفید ہے اور ہم تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے ہر استاد، طالب علم اور عام پڑھے لکھے قاری سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرے۔ یہ کتاب ہماری ہر لائبریری کی زینت بھی بننی چاہیے۔

اس امکان کے پیش نظر کہ سید عزیز الرحمن صاحب مستقبل میں اس کتاب کا نظر ثانی شدہ اور توسیع شدہ ایڈیشن بھی سامنے لائیں گے ہم چند تجاویز اس کام کو مزید موثر اور مفید بنانے کے لیے پیش کرتے ہیں: **ایک** تو یہ کہ ذیلی عنوانات ضرور لگائے جائیں۔ کتاب میں ’’اکیسویں صدی میں پاکستان کے تعلیمی تقاضے‘‘ کے عنوان سے ڈاکٹر غازیؒ کی تقریر ۱۲۹ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور اس میں کوئی ذیلی عنوان نہیں۔ یہ طوالت بوریت اور عدم تفہیم کا سبب بنتی ہے۔ **دوم:** موجودہ خطبات زیادہ تر دینی مدارس کی تعلیم سے متعلق ہیں اور جدید تعلیم کے بارے میں غازی صاحب کے موقف کو زیادہ سامنے نہیں لاتے۔ اس کا تدارک ہونا چاہیے۔ **سوم:** مضامین و تقاریر کے مجموعوں میں تکرار (Repetition) ایک مجبوری ہوتی ہے تاہم ’محاضرات تعلیم‘ پڑھتے ہوئے اس کا کچھ زیادہ ہی احساس ہوتا ہے۔ کتاب کے فاضل مرتب کچھ ہنر آزمائیں۔

۳۶۵ صفحات کی یہ کتاب زوار اکیڈمی پبلی کیشنز اے ۴/۱۷ ناظم آباد ۴، کراچی سے دستیاب ہے۔ قیمت درج نہیں۔ رابطہ: 021-36684790

تبصرۂ کتب　　　مدیر

دلیل کے نام پر اسلامی تصورات کی مغربی فکر کے دلائل پر مبنی تعبیرِ نو کرنا فکری افلاس اور ذہنی غلامی کی دلیل ہے

دلیل کا دور
بنک انٹرسٹ ۔ منافع یا ربا؟

مولف: محمد انور عباسی، اسلام آباد

ان کتابوں میں مؤلف کا اسلوب شائستہ اور سنجیدہ ہے۔ مقدمہ میں انہوں نے عربی میں مہارت نہ ہونے کا ذکر کیا لیکن ان کی اٹھائی گئی بحثیں مدلل ہیں اور حوالہ جات کا باقاعدہ اہتمام کیا گیا ہے۔ طباعت بھی عمدہ ہے۔ تاہم ناشر کو چاہیے کہ قرآنی آیات پر اعراب کا اہتمام کرے جو اب آسانی سے نیٹ پر دستیاب ہیں۔ املاء کی تصحیح کا مزید اہتمام بھی درکار ہے۔

زیر تبصرہ کتب میں فاضل مصنف نے حق و باطل یا صحیح اور غلط کا عجیب آمیزہ پیش کیا ہے مثلاً 'دلیل کا دور' کا پہلا حصہ جو مغربی فکر پر تنقید پر مشتمل ہے، اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن صحیح فکر کا حامل اور جاندار ہے لیکن کتاب کا دوسرا حصہ جو اسلامی تصورات و احکام پر مشتمل ہے، ان کے دلائل مہیا کرتے ہوئے وہ جاوید غامدی صاحب اور عمار خاں ناصر صاحب کا تتبع کرتے ہیں اور اسلامی احکام کی تعبیر مغربی فکر و دلائل کے مطابق کرتے ہیں مثلاً جہاد والے باب کو دیکھ لیجیے۔

ہم اس سے پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ جہاد کے بارے میں غامدی صاحب کا موقف وہی ہے جو غلام احمد قادیانی کا ہے اور قادیانی کا موقف وہی ہے جو مغرب چاہتا ہے۔ مغرب یہ چاہتا ہے کہ وہ اسلام اور مسلم دشمنی میں جب مسلمان ملکوں پر حملہ کرے تو مسلمان اسے جہاد قرار دے کر اس کی مزاحمت نہ کریں بلکہ سر جھکا کر کہیں کہ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم میں یورپ نے جب ترک علاقوں پر قبضہ کیا تو جعلی نبی نے قادیان میں خوشی سے چراغاں کیا کہ اس کی مہربان حکومت کو اللہ نے فتح دی ہے۔ یہی حال غامدی اور عمار صاحب کا ہے کہ اہل مغرب نے افغانستان پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا لیکن غامدی صاحب کا کہنا یہ ہے کہ امریکی موقف صحیح ہے اور افغانیوں کی امریکہ کی مزاحمت جہاد نہیں ہے۔ اسی طرح یہودیوں نے بیت المقدس مسلمانوں سے چھین لیا اور ان کے دل فگار ہیں لیکن عمار صاحب کہتے ہیں کہ قبلہ اوّل پر یہودیوں

کا حق فائق ہے اور مسلمان وہاں ناجائز قابض ہیں۔ظاہر ہے کہ غامدی صاحب اور عمار صاحب کا موقف 'دلیل' پر مبنی ہے۔ دوسری طرف جہاد کے بارے میں اسلام یا چلیے یوں کہہ لیں کہ جمہور مسلمانوں کا جو موقف ہے، وہ بھی دلائل پر مبنی ہے لیکن غامدی صاحب، عمار ناصر صاحب اور انور عباسی صاحب اسلام کی 'دلیل' کو رد کر کے 'مغرب کی دلیل' کو صحیح باور کراتے ہیں، بلکہ عباسی صاحب کی فکری جرأت تو یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ بالواسطہ طور پر یہ تاثر دیتے ہیں کہ جہاد کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا موقف قرآن کے خلاف ہے (دلیل کا دور ص: ۱۱۵، ۱۱۶) یہ بات اسی طرح اشتعال انگیز ہے جس طرح غامدی صاحب نے 'میزان' میں سورہ نور میں مذکور کوڑوں کی سزا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زانی غیر محصن کے ساتھ مختص کرنے کو خلاف لغت ہونے کا تاثر دیا ہے۔

عباسی صاحب نے اپنی کتاب ''بنک انٹرسٹ۔منافع یا ربا'' میں یہ بات صحیح لکھی ہے کہ 'اسلامی بنکنگ' کے نام پر بعض مسلم ممالک اور پاکستان میں جو ایکسرسائز جاری ہے وہ برائے نام اسلامی ہے اور دراصل مغربی بنکنگ اور ان کی پروڈکٹس ہی کو اسلامی اصطلاحات میں پیش کر کے شریعت کا جامہ پہنایا جا رہا ہے۔لیکن اس کتاب میں ان کی دوسری بڑی تھیم یہ ہے کہ مغربی معیشت میں بنکوں سے قرض لیے جانے پر جو اضافی رقم دی جاتی ہے وہ 'ربا' نہیں ہے۔ہم اس وقت ان کے دلائل کے تفحص میں نہیں جا سکتے کہ اس کے لیے کئی سو صفحات درکار ہیں البتہ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان کے اس موقف کا نتیجہ کیا نکلتا ہے اور اس کا Beneficiary کون ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ اس دلیل اور موقف کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مغرب کا سرمایہ دارانہ سودی نظام عین اسلامی ہے اور اسے غیر اسلامی کہہ کر رد نہیں کرنا چاہیے۔

اسلام عقلی دلائل کا انکار نہیں کرتا بلکہ ہر دعوی دلیل کے ساتھ کرتا ہے لیکن وہ مغرب کی طرح عقل کو رہبر مطلق نہیں مانتا بلکہ وحی کے تابع رکھتا ہے۔اسلام عقل کے ساتھ غیب پر ایمان لانے اور قلب کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ قرآن وسنت اور ان کے تتبع میں محقق صوفیاء نے قلب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے آج کی سائنس اس کی تائید کر رہی ہے۔ اور واشنگٹن کے ہارٹ میتھ انسٹی ٹیوٹ جیسے ادارے اسلامی موقف کی تائید کر رہے ہیں۔امریکہ میں پاکستانی سائنسدان ڈاکٹر مشتاق گوہر نے اس پر کام کیا ہے اور البرہان میں بھی ان کی بعض چیزیں طبع ہوئی ہیں۔

ہر آدمی کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے۔غامدی صاحب (اور ان کے متبعین) اپنی آراء کے حق

میں جو دلائل پیش کرتے ہیں اور اسلامی دلائل کی جو توجیہات پیش کرتے ہیں، ہم کبھی ان سے اس بحث میں نہیں پڑے کہ ان کا موقف کس طرح غلط ہے اور جمہور اہل علم کے موقف سے کیوں اور کس طرح مختلف ہے (یہ کام دوستانہ انداز میں زاہد صدیق مغل صاحب اور مولانا زاہد الراشدی صاحب، علمی انداز میں خالد جامعی صاحب اور ڈاکٹر زبیر صاحب، صوفیانہ انداز میں موسیٰ بھٹو صاحب اور علمی ومناظرانہ انداز میں حافظ صلاح الدین یوسف صاحب اور مولانا محمد رفیق صاحب بخوبی کررہے ہیں) اور جمہور کے نزدیک وہ اسلام کی غلط تعبیر ہے.... بلکہ ہم یہ کرتے ہیں کہ غامدی صاحب کے موقف کو مغربی موقف ثابت کردیتے ہیں جو نہ صرف مغربی فکر کے مطابق ہوتا ہے بلکہ مغربی مفاد اور تقاضوں کے مطابق بھی ہوتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ مغربی فکر سے مرعوب اور اسلامی فکر سے پسپائی والی ذہنیت کے حامل ہیں اور اسلام کی تعبیر وتشریح مغربی فکر اور مفادات کے مطابق کرتے ہیں۔ اور اہل مغرب کی اسلام اور مسلم دشمنی ہر کہہ ومہ پر ظاہر ہے سوائے ان کے جو مغربی فکر کی عینک لگائے ہوئے ہیں۔ جہاد کے حوالے سے محمد انور عباسی صاحب کا موقف وہی ہے جو جاوید غامدی صاحب اور غلام احمد قادیانی کا ہے۔

مغربی فکر سے مرعوب ہمارے دانشوروں کی عجیب حالت ہے۔ انہیں احساس نہیں کہ وہ ایک ڈوبتے جہاز کے مسافر ہیں۔ خود مغرب کے اہل علم وفکر کہہ رہے ہیں کہ ہماری تہذیب مررہی ہے اور روبہ زوال ہے۔ 'تہذیبوں کے تصادم' میں ہنٹنگٹن نے بھی کہا ہے کہ مغربی تہذیب شاید ہی اکیسیویں صدی نکال سکے لیکن ہمارے بعض غلام ذہن مغربی فکر سے ایسی والہانہ شیفتگی رکھتے ہیں کہ اپنی فکر، اپنی تہذیب اور اپنے دلائل چھوڑ کر مغربی فکر، مغربی تہذیب اور مغربی دلائل کے گن گانے میں مصروف ہیں اور اپنی دینی فکر کو اہل مغرب کے دلائل کے مطابق توڑ موڑ کر پیش کرتے ہیں۔

اس وقت جب کہ امت زوال سے نکلنے کے لیے کوشاں ہے۔ ضرورت فکری صلابت اور استقلال کی ہے، اپنے دین سے جڑنے کی ہے نہ کہ عقلی دلیل کے نام پر استعمار واغیار کی فکر سے خوشہ چینی کی۔ اس لیے مغربی فکر وتہذیب کو رد کرنا اور اسلامی اصول واقدار پر استقامت اختیار کرنا وقت کی ضرورت ہے۔

دونوں کتابیں ایمل پبلی کیشنز ۱۲، سیکنڈ فلور مجاہد پلازہ بلیو ایریا اسلام آباد (فون: 0342-5548690) نے شائع کی ہیں قیمت ''دلیل کا رد'' ۴۲۰ روپے (صفحات ۲۱۱) اور ''بنک انٹرسٹ: منافع یا ربا'' قیمت ۷۵۰ روپے (۳۲۷ صفحات)۔